یادِ ایام

(حصہ دوم)

(خود نوشت سوانح حیات)

عالیجناب سعید الملک نواب ڈاکٹر سر حافظ محمد احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری

جی بی ای، کے سی ایس آئی، کے سی آئی ای، ایل ایل ڈی

سابق گورنر صوبہ یوپی و وزیر اعظم حیدرآباد (دکن)

اختر پرنٹنگ ورکس علی گڑھ

یادِ ایام

(حصہ دوم)

(خود نوشت سوانح حیات)

عالیجناب سعید الملک نواب ڈاکٹر سر حافظ محمد احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری

جی بی ای، کے سی ایس آئی، کے سی آئی ای، ایل ایل ڈی

سابق گورنر صوبہ یوپی و وزیر اعظم حیدر آباد (دکن)

فہرست مضامین

دگر از سر گرفتم قصّۂ زلفِ پریشاں را

میں ۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ واپس آگیا۔
حیدرآباد سے کیوں واپس آیا وہاں میں کیا کرنا چاہتا تھا۔
صرف چار مہینے اکیس روز کی قلیل مدت کے بعد میں نے کیوں علیحدگی اختیار کی۔
یہ تمام باتیں اگر خدا کو منظور ہے تو اپنے موقع پر بیان ہوں گی۔
یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ پھر وہی فرصت کے رات دن شروع ہو گئے اور ایک بار پھر گذری ہوئی زندگی اور زمانہ کے اوراق پر نظر ڈالنے کا موقع مل گیا اور پھر عمرِ گذشتہ کی کہانی دہرانی شروع کر دی۔

سول نافرمانی ۱۹۳۰ء

۲۱-۲۳ء کی تحریکِ ترکِ موالات کے ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا پرسکون ہو گئی تھی یوں کانگریس کا کام جاری تھا لیکن قانون کی خلاف ورزی کا پروگرام ترک کر دیا گیا تھا۔
۲۹ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس کے صدر پنڈت جواہرلال نہرو ہوئے۔ اسی اجلاس میں کانگریس نے خود مختاری کا ریزولیوشن کیا اور ۲۶ر جنوری مقرر کی گئی جس دن لوگ جمع ہو کر اس ریزولیوشن کو پڑھیں۔

اس اقدام نے میرے سکونِ قلب پر بجلی گرادی ۔میں جانتا تھا کہ سول نافرمانی شروع ہوگی تو برٹش گورنمنٹ اسے روکنے کی کوشش کرے گی ۔ بے شمار لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں گی ۔ حکومت کی پالیسی بے جا سختی کے خلاف کتنی ہی کیوں نہ ہو عمالِ حکومت سے جہاں تہاں زیادتی ضرور عمل میں آئے گی ۔ دوسری جانب کہیں یہ تحریک تشدد کا پیرایہ اختیار کرے گی وہاں دشواریاں بہت بڑھ جائیں گی ۔میں جانتا تھا کہ جب کبھی ملک میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے خواہ وہ کسی جنگِ عظیم کا نتیجہ ہو یا اس قسم کی تحریک کا ۔ لوگوں کے دل سے قانون کی وقعت جاتی رہتی ہے اور جرائم کی تعداد بڑھ جاتی ہے ۔ برٹش حلقوں میں بڑا ہیجان تھا ۔حکومت نے یہ طے کیا کہ یو۔پی میں کوئی گرفتاری ۲۶ جنوری کو محض اس وجہ سے نہ ہوں کہ خود مختاری کا رزیرولیوشن دہرایا گیا ۔

حکومت کے حلقوں میں یہ خیال عام تھا کہ اس بار تحریک قانون شکنی اتنی کامیاب نہ ہوگی جتنی کہ ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی ۔ وہ اس نتیجہ پر اس وجہ سے بھی آئے تھے کہ پہلی بار اس تحریک میں مسلمانوں نے بڑی سرگرمی دکھائی تھی ۔مسلمان پیش پیش تھے اور ہندو مسلمان دونوں یک جہت اور یک دل تھے ۔اس کے چند ہی روز بعد شدھی کی تحریک شروع ہوئی جس کے کرتا دھرتا سوامی شردھانند بتائے جاتے تھے ۔ یہ بھی شہرت تھی کہ یہ تحریک سیاستِ فرنگ کا کارنامہ تھی ۔ تصدق حسین سی۔آئی۔ای جو خفیہ پولیس کے ایک مفید رکن تھے مجھ سے کہتے تھے کہ اس تحریک کے بعض لیڈر تنخواہ دار تھے ۔ وجہ کچھ بھی ہو اس تحریک نے مسلمانوں کو برادرانِ وطن سے مشکوک کر دیا ۔ وہ کسی ایسی تحریک میں اب سرگرمی سے حصہ لینے کو تیار نہ تھے ۔میرا خود بھی یہی خیال تھا کہ تحریک قانون شکنی نسبتاً ناکام رہے گی لیکن یہ اندازہ قطعاً غلط ثابت ہوا ۔

۲۶ جنوری کو جب خود مختاری کی قرارداد کو دہرانا قرار پایا تو خیال سے زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے جس سے کانگریس کے قائدین کو یقین ہوگیا کہ اہلِ ملک نئے سر سے جدوجہد کے لئے آمادہ ہیں ۔ کانگریسی حلقوں میں یہی سوچا جارہا تھا کہ سول نافرمانی شروع کیوں کر کی جائے کہ ملک کے سب سے بڑے نبض شناس مہاتما جی نے کہا کہ نمک کا قانون توڑا جائے ۔ نمک بنانے کے واسطے مہاتما جی نے ڈانڈی کا پیادہ سفر شروع کر دیا ۔ انگریزی حلقوں میں مہاتما کے اس پروگرام پر سخت حیرت تھی ۔ اس کے ناکام ہونے کا ان حلقوں

اتنا یقین تھا کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ مجھے بھی اس پر تو تعجب ہوتا تھا کہ کسی قومی تحریک کو نمک کا قانون توڑ کر کیونکر فروغ دیا جائے گا۔ لیکن میں اسے مذاق خیال نہیں کرتا تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ سوال یہ نہیں تھا کہ پروگرام کیا تھا، پبلک کی نظر میں سوال فقط یہ تھا کہ مہاتما جی نمک کا قانون توڑنا چاہتے تھے لہذا ان کے حکم کی تعمیل ہو۔ ہندوستان کے لوگوں کو جس قدر اعتماد مہاتما جی پر تھا اس کی مثال میری نظر سے تاریخ میں نہیں آئی وہ اعتقاد ایک طرح کا مذہبی جذبہ تھا جس نے مہاتما جی کی رہنمائی میں سیاسی صورت اختیار کر لی تھی سول نافرمانی کی لہر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔ گو مسلمانوں نے اس بار اس سرگرمی سے حصہ نہیں لیا جیسا پہلے لیا تھا۔ لیکن اس کی تلافی اس سے ہو گئی کہ ہندو صاحبان میں پڑھے لکھے لوگ کلیتاً کانگریس کے ہم خیال ہو گئے۔

یو۔پی گورنمنٹ کی پالسی

یو۔پی میں میری پالسی یہ تھی کہ زیادہ سختی نہ کی جائے۔ گو اس کا تعلق تمام ہندوستان سے تھا اور اس کے متعلق ہر پالیسی دہلی میں طے ہوتی تھی لیکن صوبہ کی حکومتوں کو بھی مشورہ دینے کا موقع تھا جس سے میں فائدہ اٹھاتا تھا۔

اس سلسلہ میں میرے روزنامچہ مورخہ ۳ر فروری کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"آج دو بجے گورنر کے پاس گیا تھا۔ بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے اُن سے صاف کہا کہ اگر آپ نے سختی سے اس تحریک کو دبایا تو دو تین برس کے لئے دب جائے گی مگر پھر اُبھرے گی۔ البتہ یہاں کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو پھر یہ تحریک ... ... کبھی زندہ نہ ہو گی۔ انھوں نے اسے مانا۔ بہرحال آج اُن کا رنگ اچھا تھا۔ شاید میرے نوٹ مورخہ ۱۵ر جنوری کا اثر پڑا کہ میں نے ان کی سختی کی پالسی سے اختلاف کیا تھا"

اس جگہ میں ۸ر فروری کے روزنامچہ کا اقتباس دیتا ہوں۔

"لارڈ ارون سے ملاقات ہوئی تھی۔ سنیچر ۸ر فروری .. .. اس کے بعد مجھ سے واقعات حاضرہ پر گفتگو کی۔ وہ "کہئے آپ کی کیا رائے ہے؟" میں۔ ۲۶ر کے واقعات کا (اشارہ ۲۶ر جنوری کے خود مختاری کے اعلان کی طرف ہے) گو آگرہ اور بنارس میں زور تھا مگر عام طور پر لوگوں پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔ میری رائے میں بہت سے لوگ حضور سے کہتے ہوں گے کہ سختی کی جائے۔ مگر میرے خیال میں سوائے اس حالت کے کہ جب لگان نہ دینے کی تحریک یا قانون شکنی کی ترغیب ہوتی ہو سختی نہ کی جائے۔ اس وجہ سے کہ ایسی سختی سے ممکن ہے کہ بالفعل تحریک رُک جائے لیکن جس وقت لوگ جیل سے واپس آئیں گے پھر یہی حال ہوگا۔ اور اگر یہ تحریک خود مٹ گئی اور لوگوں نے اس کی پروا نہ کی تو پھر بہت زود کو مٹ جائے گی۔"

وہ۔ "میں یہی ان لوگوں سے کہتا ہوں جو مجھے سختی کی رائے دیتے ہیں۔" پھر بولے۔

" You can create desert and call it peace but what is the use of it. "

یہ پالیسی لارڈ ارون کے زمانے تک تو کچھ چلتی رہی مگر لارڈ ولنگڈن کے زمانے میں رنگِ محفل مختلف تھا۔

لارڈ پیل سے مُلاقات

ان ہی دنوں لارڈ پیل سابق وزیر ہند سے گفتگو کا موقع ملا۔ یہ جنوری ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ آئے تھے۔ قیافہ سے مستقل مزاج اور طاقتور طبیعت کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ڈنر کے بعد یہ اور میں ایک صوفہ پر بیٹھ گئے۔

میرے اس جنوری کے روزنامچہ میں حسب ذیل عبارت درج ہے۔

جمعہ ۱۰ر جنوری۔ "وہ (لارڈ پیل) ایک زبردست آدمی معلوم ہوتے ہیں مگر ہندستان کے خلاف ہیں۔ مجھے ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ اصلاحات کے خلاف ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ پیچھے ہٹنا تو درکنار جہاں آپ ہیں وہاں بھی نہیں رُک سکتے بلکہ آگے بڑھنا ہوگا ورنہ اعتدال پسند بھی انتہا پسند ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ اصلاحات میں گورنر کی کیا پوزیشن ہونی چاہیئے۔ میں نے کہا وہ کونسٹی ٹیوشنل گورنر ہوگا۔ سوائے اس کے کہ جہاں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا سوال ہو وہاں اسے اختیار ہو یا جہاں اُسے یقین ہو کہ نقص امن کا اندیشہ ہے۔ پھر سروس کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا انھیں منتقل کرنے میں حرج نہیں ہے۔ منتقلہ صیغوں میں جو انگریز ہیں انھیں کوئی شکوہ کا موقع ہنوز نہیں آیا اور آئندہ بھی کم از کم ہمارے وزراء کا خیال ہے کہ بیس فی صدی انگریز ملازمتوں میں ہوں"۔

سول نافرمانی میں بی بیوں کی شرکت

اس بار سول نافرمانی میں ہزارہا کی تعداد میں لوگ جیل گئے۔ کیمپ جیل تک بنوانے پڑے۔ مہاتما جی کے ڈنڈی پا پیادہ سفر نے گویا ہندوستان کو سوتے سے جگا دیا۔ مگر میں سیاسی یا سول نافرمانی کی تاریخ نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو اپنے قلب میں فقط ان نقوش کو اُبھار رہا ہوں جو امتداد زمانہ سے دھندلے پڑ گئے ہیں۔ میں ایک روز انھیں دونوں جیل کے معائنہ کے واسطے گیا۔ شاید الہ آباد کا نینی جیل تھا۔ ایک دروازے سے داخل ہوا تو دیکھا یک بیک میرے سامنے مسز پنڈت۔ اوما نہرو اور کئی معزز خواتین کھڑی نظر آئیں جن میں اکثر میری دوست بھی تھیں اور مادر ہند کی بہترین بیٹیاں تھیں۔ میں ان سے ڈرائنگ روم میں ملنے کا عادی تھا۔ ان کو اس ماحول میں پاکر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ میں ہکا بکا سا رہ گیا۔ اس پر یہ طرہ اور ہوا کہ وہاں کرسیاں فقط اتنی ہی تھیں جتنی کہ خواتین۔ میں نے ان سے بیٹھ جانے کی خواہش کی تو

ان کا اخلاق اسے گوارا نہ کرتا تھا کہ میں کھڑا رہوں اور میں بیٹھ جاؤں اور ایک خاتون کھڑی رہے یہ مجھ سے ممکن نہ تھا۔ ٹھیک یاد نہیں مگر جہاں تک خیال پڑتا ہے میری التجا پر یہ بیٹھ گئیں۔ اس واقعہ نے میری تکلیف میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میری آنکھیں قلبی حالت کو ظاہر کرنے لگیں میں جلد رخصت ہو کر چلا آیا۔ مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ میری اس روز کی قلبی حالت کو میرے سوا کوئی اور بھی جانتا تھا۔ برسوں کے بعد ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں ایک روز مسز لکشمی پنڈت میرے ہاں کھانے پر مدعو تھیں۔ مجھے چھیڑتے ہوئے مذاقاً کہنے لگیں کہ "یہ ایسے ہوم ممبر تھے کہ اپنے قیدیوں کو دیکھ کر رونے لگتے تھے" اور اس واقعہ کی یاد دلائی۔

پہلی بار اس تحریک قانون شکنی میں فقط مردوں ہی نے حصہ لیا تھا۔ لیکن اس بار خواتین بھی حصہ لے رہی تھیں۔ ان کی شرکت نے اس تحریک میں بڑا جوش پیدا کر دیا۔ ایک جانب تو عوام میں اس سے بے انتہا ہیجان پیدا ہو گیا۔ دوسری جانب ملازمین گورنمنٹ کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ جو اس تحریک میں شریک نہ تھے وہ بھی شریف گھروں کی بہو بیٹیوں کو اس طرح سختیاں جھیلتے اور جیل جاتے دیکھ کر پریشان تھے۔ اس سے نئی نئی انتظامی دشواریاں پیدا ہونے لگیں۔ مثلاً پولیس میں تمام مرد ملازم تھے، مکانات اس قابل نہ تھے کہ اس طبقہ کے مردوں کو بھی رکھا جائے بی بیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ کہیں کہیں اس کی کوشش بھی کی گئی کہ عمارت میں کچھ ردو بدل کر کے آرام دہ بنایا جائے۔

اس دوران میں جہاں کہیں دورہ پر جاتا جیل کا بالخصوص معائنہ کرتا۔ دشواری یہ تھی کہ ملازمین قواعد کا منشا سمجھنے میں غلطیاں کرتے تھے۔ ممکن ہے اُن کے افسران غلطیاں کراتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ الفاظ کے معنے تنگ سے تنگ دائرہ میں مقید ہو جاتے تھے۔

ایک بار الہ آباد جیل میں معائنہ کو گیا۔ وہاں پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور پنڈت جواہر لال جی بھی تھے۔ شاید ڈاکٹر محمود بھی تھے۔ یہ ایک جیل کا علیحدہ حصہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس جیل میں اس سے بہتر جگہ نہ ہو لیکن ان حضرات کے لئے یہ بالکل ناکافی اور غیر موزوں تھا۔ اس میں ایک برآمدہ بڑھایا گیا تاکہ کچھ رفع تکلیف ہو۔ پنڈت جی بہت ضعیف تھے۔ وہ ایک آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر باتیں

کرتا رہا۔ گو ان کی صحت اچھی نہ تھی مگر گفتگو میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی شگفتگی جو ہمیشہ میں نے ان میں پائی اس وقت بھی موجود تھی۔

جہاں تک یاد ہے چند ہی روز کے بعد بخیال صحت پنڈت جی کو رہا کر دیا گیا۔

یوں تو اکثر جگہ سے میرے پاس شکائتیں آتی تھیں مگر ایک کالیستھ صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل تھے۔ وہ کچھ اس درجہ سخت مزاج واقع ہوئے تھے کہ جس جیل میں ان کی تعنیاتی ہوتی وہاں سے شکائتیں ضرور آتیں۔ وہ ضلع گونڈہ کے جیل میں تھے۔ وہاں سے بہت شکائتیں آئیں۔ میں نے انسپکٹر جنرل سے تو پوچھا تو وہ اس سپرنٹنڈنٹ کی تعریف کے ایسے گیت گانے لگے کہ مجھے حیرت ہوئی اور اس کا یقین ہو گیا کہ میرا اور انسپکٹر جنرل کا زاویہ نظر ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ آخر کار میں نے ان سپرنٹنڈنٹ جیل کو نینی تال بلا کر فہمائش کی اس کے بعد ان کی سخت مزاجی میں کچھ کمی آئی۔

میرا عقیدہ ہے کہ قواعد کیسے ہی ہوں تمام تر مدار اس پر ہے کہ عمل کرنے والا کون ہے۔ قواعد ایک ہی تھے لیکن ایک دوسرے سپرنٹنڈنٹ میجر سلامت اللہ کی شکایت کبھی میرے کانوں تک نہیں پہنچی اس زمانے کے قانون کے مطابق تمام سکریٹریوں اور محکموں کے افسر اعلیٰ یعنی انسپکٹر جنرل یا ڈائرکٹر جنرل کو یہ حق تھا کہ وہ گورنر سے نجی ملاقات کریں۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس سے قبل کہ ممبر حکومت کسی مسئلہ خاص کو گورنر کے سامنے پیش کرے یہ مسئلہ گورنر کے گوش گذار ہو جاتا تھا اور اس کے وہ پہلو گورنر کے ذہن نشین ہو جاتے تھے جنھیں سکریٹری یا انسپکٹر جنرل ذہن نشین کرانا چاہتے۔ اکثر یہ سب ممبر گورنمنٹ کے بغیر علم و اطلاع ہوتا تھا۔ جب قاعدہ کے مطابق ممبر انچارج حکم آخر کی تجویز کو گورنر کے پاس لے جاتا تو اسے دشواریاں ہوتی تھیں۔ رد و قدح ہوتی اور جب تک یہ ثابت نہ ہو جاتا کہ محکمہ کی رائے غلط ہے گورنر کو اتفاق رائے نہ ہوتا تھا۔

مجھے فروری ۱۹۳۱ء کا ایک واقعہ یاد آگیا۔

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا۔ اسمبلی کا اجلاس اس روز ہونے والا تھا۔ سر روبرٹ ڈوڈ

(انسپکٹر جنرل پولیس) نے آکر مجھ سے کہا کہ ایک جلوس خواتین کا کونسل چیمبر کی طرف آرہا تھا۔ ان کا منشا یہ تھا کہ چیمبر کے سامنے آکر مظاہرہ کریں اور ممبران کو چیمبر کے اندر جانے سے روکیں۔ انسپکٹر جنرل نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے پولیس کے ذریعہ سے اس جلوس کو سڑک پر رکوادیا ہے۔ خواتین سڑک پر بیٹھ گئی ہیں۔ حکومت کی دشواری یہ تھی کہ نہ تو یہ ہی مناسب تھا کہ چیمبر کے دروازے پر مظاہرہ ہو اور اسمبلی کے جو ممبر اندر آنا چاہیں انھیں پریشانی سے دوچار ہونا پڑے اور نہ یہ اچھا تھا کہ خواتین کو گرفتار کیا جائے۔

میں نے کہا کہ ان کے چند لیڈروں کو اجازت دی جائے کہ وہ کونسل چیمبر کے دروازے پر جو مظاہرہ کرنا چاہیں کرلیں۔ چنانچہ مسز متر ا اور مسز بخشی آئیں۔ انھوں نے کچھ پرچے تقسیم کئے اور ایک تقریر کی۔ میں نے انسپکٹر جنرل سے کہا کہ انھیں میرے دفتر کے کمرے میں بلا لیا جائے۔ ایک یورپین اے۔ ایس۔ پی انھیں بلانے گیا۔ لوٹ کر آیا تو اس نے کہا کہ "جناب وہ کہتی ہیں کہ ہم کیوں ہوم ممبر کے دفتر جائیں ہمیں کیا غرض"۔

یہ انداز مجھے بھی ناگوار ہوا لیکن انسپکٹر جنرل کے چہرے سے ناگواری کا اظہار بہت ہی صاف طور پر عیاں تھا۔ میں نے تھوڑی سی خاموشی کے بعد "مسٹر روبرٹ سے کہا "مسٹر روبرٹ وہ بادشاہ کی رعایا ہیں اور میں ملازم، اگر وہ میرے پاس نہیں آتیں تو مجھے اُن کے پاس جانا چاہیئے"۔ یہ کہہ کر میں دفتر سے اُٹھا اور کونسل چیمبر کے بڑے دروازے پر پہنچا۔ وہاں یہ دونوں کھڑی تھیں اور مسز متر ا کچھ تقریر کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی برہمی میں کچھ اضافہ ہو گیا اور روئے سخن میری طرف پھرا۔ میرے آنے کا منشا یہ تھا کہ اس قضیہ کو بغیر ناگواری کے طے کر دیا جائے۔ لیکن جب مزاج کا پارہ اتنا اونچا ہو تو پھر کس امید پر بات کی جائے۔ میں مسز متر ا سے خوب واقف تھا اور میری بیوی سے تو ان کی دوستی تھی۔

جوں ہی وہ رُکیں میں نے گفتگو شروع کر دی۔ اب الفاظ تو حرف بحرف یاد نہیں لیکن منشا یہ تھا کہ آپ کی شورش سے نپٹنا میرے لئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں نے کہا کہ گورنر سے میں نے

کہنا چاہتا ہوں کہ آئندہ میں اور میری بیوی مشترکہ ہوم ممبر ہوں تو کام میں سہولت ہو۔ آپ کی پیدا کی ہوئی شورش کو تو وہ ہی سنبھال سکیں گی۔" مسز متھرا کا غصہ کچھ کم ہوا تو میں نے کہا کہ "مجھے بتائیے کہ آپ کیا چاہتی ہیں"۔ آخر یہ قرار پایا کہ وہ اپنا جلوس لائیں۔ جب کونسل چیمبر کے سامنے آئیں اور اندر کی سڑک پر مڑنا چاہیں تو ہمارا ایک چپراسی یہ کہہ دے کہ "یہ شاہراہ عام نہیں ہے"۔ جلوس آگے کو نکل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

میں یہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ ایک طرف تو یہ تحریک اس ملک کے لوگوں میں خود داری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ یہ بڑی صفات ہیں۔ لیکن دوسری جانب نوجوانوں میں ایسا رجحان پیدا کر دیا کہ وہ کسی نہ کسی پابندی کو گوارا کر سکتے تھے اور نہ کسی حد پر رکنا چاہتے تھے۔ تادیبِ نفس (Descipline) سے بالکل منہ موڑ لیا اور تہذیبِ نفس کو بارگراں تصور کرنے لگے۔

مجھے ایک خلجان ہوتا تھا۔ مقصد کے درست ہونے میں تو کوئی شک نہ تھا مگر حصول کا ذریعہ کہاں تک مناسب تھا۔ اس میں مجھے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو شک تھا۔ کیا نوجوان قانون شکنی کا عادی ہونے کے بعد قومی حکومت کے بھی قوانین کو توڑنا نہ چاہے گا۔ کیا ہڑتال کا حربہ وہ اتنی جلدی بھول جائے گا۔ کیا ہوا اگر قومی حکومت کو اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اگر یہ سچ ہے کہ نوجوان اس سبق کو نہ بھولے گا تو پھر اس کا نتیجہ ہندوستان کے واسطے بالعموم اور قومی حکومت کے واسطے بالخصوص کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔

شاید ان اختلافات کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگ اصلاحی ذہنیت رکھتے تھے اور بعض انقلابی خیالات کے پیرو تھے۔ اول الذکر کا خیال تھا کہ قانونی اور آئینی جد وجہد کے ذریعہ سے ملک کی آزادی حاصل کی جائے ان کا مقصد ملک کو بیرونی حکومت سے آزاد کرانا تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن دوسرے حضرات ملک کو انقلاب کے واسطے تیار کر رہے تھے کہ جس کا مقصد ملک کی سیاست کے ہر پہلو پر پڑتا تھا خواہ داخلی ہو یا خارجی۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں پھر نینی تال گیا اور وہی پروگرام شروع ہو گیا جو ہر سال ہوتا تھا۔ فائل۔ ملاقاتی دفتر۔ شام کو ٹینس لیکن سول نافرمانی اور حکومت کی کشمکش نے سخت متردد کر رکھا تھا۔

۱۸ رجون کے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ پونے چھ بجے شام کے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنمنٹ کی میٹنگ

تھی۔

"ٹینس کھیلنے کے بعد گورنمنٹ ہاؤس پہنچا۔ زیر بحث یہ امر تھا کہ باوجود اس کے کہ گورنمنٹ کہہ چکی تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو خلاف قانون قرار نہ دیا جائے، گورنمنٹ آف انڈیا کا منشا تھا کہ اسے خلافِ قانون قرار دیا جائے۔ میں نے جواب میں لکھوا دیا تھا کہ میرے نزدیک یہ انتہائی غلطی ہوگی۔ میرے اس خیال کی بذریعہ تار انھیں اطلاع دی گئی۔"

ایک صوبہ کے ہوم ممبر کی آواز کی حقیقت ہی کیا تھی۔ حکومتِ ہند نے کانگریس کمیٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔

سائمن کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق تو میں کہیں لکھ چکا ہوں۔ یہ رپورٹ کسی فریق کو بھی پسند نہ آئی۔ میرے خیال میں اس رپورٹ کا کارنامہ یہی تھا کہ اس کو رد کرنے پر سارے ہندوستان کو اتفاق تھا۔ ۲۹ اگست کو بحیثیت ہوم ممبر ایک سال کی توسیع کا گزٹ ہوا۔

عشرت کی پیدائش

۴ ستمبر کو مجھے چھتاری سے تار ملا۔ میں فوراً روانہ ہوا۔ اترولی کے اسٹیشن پر عشرت کے پیدا ہونے کی اطلاع ملی۔

گول میز کانفرنس

اب گول میز کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ برٹش حکومت کی یہ خواہش تھی کہ جس طرح ہو کانگریس کو اس میں ضرور شریک کیا جائے۔ لیکن کانگریس کی طرف سے مہاتما جی سے شرائط طے نہ پائے۔ اور کانگریس شریک نہ ہوئی۔

۱۵ جون ۳۰ء کو سر مالکم ہیلی نے مجھ سے کہا کہ میں بھی گول میز کانفرنس میں بلایا گیا ہوں۔

میرے واسطے یہ خبر خالی از دل چسپی نہ تھی۔ میں نے کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا تھا۔ یورپ دیکھنے کا شوق تھا۔ لہذا میں نے یہ طے کیا کہ چار ماہ کی چھٹی لے کر یورپ کے بعض ممالک کو دیکھتا ہوا لندن جاؤں

ہندوستان کے مسئلہ کا حل خود بہت دل چسپ تھا۔ بعض حصص میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ باقی ملک میں ہندو اکثریت۔

اکثریت حکومت خود اختیاری چاہتی تھی اور اقلیت تحفظات پر زور دیتی تھی۔ کانگریس نے کچھ اپنے شرائط پیش کئے جو حسب ذیل تھے۔

(۱) گول میز کانفرنس میں گفت و شنید اور مباحثہ کامل "ڈومنین اسٹیٹس" کی بنا پر ہوگا۔

(۲) منتخب شدہ لوگوں میں کانگریس کی اکثریت [illegible]۔

(۳) سیاسی قیدیوں کی رہائی۔

(۴) اور جہاں تک ممکن ہوسکے گورنمنٹ اسی وقت سے ڈومنین کی حکومت کے لائن پر چلائی جائے

اس سلسلہ میں لارڈ ارون نے ایک کانفرنس بھی کی جس میں مہاتما جی، پنڈت موتی لال نہرو، صاحب، سر تیج بہادر سپرو، مسٹر جناح شریک ہوئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ باہمی شکوک اس درجہ پیدا ہوگئے تھے کہ ہر فقرے میں جانبین کو بہت ایسے معنی نظر آتے تھے جو دشواریاں بڑھا دیتے تھے کانگریس پہلی گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہوئی۔

۱۱ ستمبر کو ویسرائے کی طرف سے گول میز کانفرنس کا دعوت نامہ مجھے موصول ہوا۔ میں نے قبول کر لیا۔ اس روز کے روزنامچہ میں حافظ کا مشہور شعر میں نے لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور فرقہ وارانہ مشکلات مجھے متفکر اور متردد کرتی تھیں۔

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفان موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسا ہا

یورپ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ کچھ دشواریاں محسوس ہوئیں، خیال ہوا کہ ایسا شخص ساتھ ہو جو فرنچ اور اطالوی جانتا ہو۔ مسٹر اسکوٹ اوکونر پولیس میں ڈی آئی جی تھے۔ وہ رخصت پر

پر جانے والے تھے انھیں ہمراہ لیا، اطالوی لائن سے جانے کا انتظام کیا گیا۔

۲۶ یا ۲۷ ستمبر کو نینی تال سے چل کر چھتاری آیا۔ ۲۸ کو سدھ پور حاضر ہو کر طالب نگر چلا گیا اور اپنے چچا اور چچی سے رخصت ہو کر چھتاری آگیا۔ بہت سے کاشتکار اور چھتاری اور اطراف کے لوگ کثرت سے جمع تھے میں نے ایک رخصتی تقریر کی۔ بہت سے لوگ رو رہے تھے۔ میں بھی رنجیدہ تھا۔ ہماری نظروں میں یورپ کے سفر کا تصور کچھ ایسا تو تھا کہ میں نے ایک وصیت نامہ بھی عدالت ججی میں داخل کر دیا۔ رخصت کے وقت فاطمہ رونے لگی۔ ہمارا بچہ پچیس روز کا تھا۔ اس کی مفارقت مجھے بہت گراں تھی۔ میں بھی رنجیدہ تھا ان سب کو خدا کے سپرد کیا۔ اسٹیشن اور راحت منزل پر بڑا مجمع تھا۔ نواب سر مزمل اللہ خاں میرے بجائے ہوم ممبر مقرر ہو گئے تھے اور بھی ملنے آئے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۳۰ء کو پونے پانچ بجے شام کی گاڑی سے دہلی روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر راحت بہت رویا جس کی وجہ سے دہلی تک بے قراری سی رہی۔ دہلی میں پہلی بار *Talkies* (بولنے والا سینما) دیکھا بہت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔ اسی شب کو مسعود علی خاں جو میرے چچا زاد بہن کے بیٹے ہیں آگئے۔ نواب صاحب باغپت اور ان کے چھوٹے بھائی راؤ عبدالحمید خاں مرحوم بھی آگئے۔ ان حضرات نے بھی یورپ کے سفر کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے واسطے ایسے ہم سفر باعث تفریح و مسرت تھے۔

۲۹ ستمبر کو صبح آٹھ بجے دہلی سے روانہ ہوئے۔ اسکوٹ اور کوتر بھی آگئے۔ کچھ اور دوست بھی بمبئی تک ساتھ چلے جن میں نواب بہادر طالب نگر۔ بھائی جان پیر جی صاحب مرحوم۔ عزیزم باسط علی خاں بھی تھے۔

علی الصباح بمبئی کے قریب آنکھ کھلی۔ صبح کا سہانا وقت، ہلکی ہلکی روشنی میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سیاہ تاڑ اور کھجور کے درخت بہت ہی بھلے معلوم ہوئے۔ میں بمبئی تاج ہوٹل میں ٹھہرا۔ دن میں ٹومس اینڈ کوک سے ٹکٹ اور روپیہ کے تبادلہ کا انتظام کیا۔ کچھ خرید و فروخت کی۔ فاطمہ اور راحت کو خط لکھے۔ دوسرے روز جہاز جانے کو تھا سویرے سے سو رہے۔ تین بجے شب کو میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ لیاقت علی خاں جو اس سفر میں میرے ساتھ رہے تھے کھانسی سے پریشان ہیں۔ میں نے بجلی کا پنکھا بند کر دیا

اور ان کی آنکھ لگ گئی۔ لیکن آخر حصہ ستمبر کا موسم بمبئی میں ذرا بھی خوش گوار نہیں ہوتا۔ موسم سرما تو ابھی شروع ہوا نہ تھا مگر برساتی ہوائیں سمندر سے آنا بند ہو چکی تھیں۔ مجھے کسی طرح نیند نہ آئی۔ میں ایک کرسی پر سمندر کی جانب کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے رات کو ختم ہوتے اور صبح کو نمودار ہوتے سمندر پر دیکھا۔ موجوں کا سناٹا تھوڑے تھوڑے توقف سے ان کا کنارہ سے ٹکرانے کی آواز بڑی ہی عجیب اور دل کش تھی۔ آہستہ آہستہ اندھیرا کم ہوتا گیا۔ سامنے کی پہاڑیوں کے سیاہ خاکے نظر آنے لگے۔ نیچے سمندر کے کنارے سڑک پر کچھ چہل پہل شروع ہو گئی۔ میں نے کرسی سے اُٹھ کر صبح کی نماز کا اہتمام شروع کر دیا۔ یکم اکتوبر کو گیارہ بجے ہم لوگ جہاز پر سوار ہوئے۔ اس جہاز کا نام پلسنا تھا رخصت کا وقت بہرحال مغموم اور محزون بنا دیتا ہے۔ جس وقت عبدالسمیع خاں اور دوسرے رفقا رجہاز سے کنارے جانے لگے تو خاصی تکلیف ہوئی۔ ہماری پارٹی میں نواب صاحب باغپت مسعود علیخاں لیاقت۔ اسکوٹے اکونرا دررا ؤ عبدالحمید خاں مرحوم تھے۔

جہاز کا سفر

جہاز روانہ ہوا اور دیر تک ساحل اور اہل ساحل نظر کے سامنے رہے۔ ہم لوگ اپنے اپنے کمروں یا کیبن میں گئے۔ میں نے کیبن ڈی لوکس لیا تھا جس میں لیاقت علی خاں اور میں دونوں تھے۔ کمرہ بہت آرام دہ تھا۔ لنچ کے بعد سمندر کو دیکھتا رہا۔ میرے واسطے یہ سمندر کا پہلا سفر تھا۔ ہر چیز نئی اور دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ اُڑنے والی مچھلیاں موجوں سے نکل کر اڑتی ہوئی بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے راحت پہنچانے کی ذمہ داری تو لیاقت خاں پر تھی جسے انھوں نے نہایت محنت اور محبت سے انجام دینا شروع کیا۔ اور میں صبح سے شام تک یا کوئی کھیل کھیلتا خاصکر ڈیک ٹینس یا کرسی پر لیٹا ہوا کتاب پڑھتا رہتا۔ ۱۳ر اکتوبر کو مجھے یکایک پریشانی اور گھبراہٹ شروع ہوئی۔ میں نے اپنی نبض دیکھی تو میرا دل پانچ چھ بار چل کر ایک حرکت (بیٹ) غائب کرتا تھا۔

یہ شکایت مجھے ایک بار لکھنؤ میں بھی ہو چکی تھی۔ میرے ساتھ دواؤں کا بکس تھا۔ میں نے دوائیں

استعمال کرنا شروع کردیں۔

اپنے ہم سفر حضرات سے میں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ پریشان ہونگے اور چارہ سوائے جہاز کے ڈاکٹر کے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن میں تھا متفکر۔ مرزا غالب کو اس کی تمنا ہوگی۔ مگر مجھے یہ آرزو نہ تھی کہ نہ کبھی جنازہ اٹھے اور نہ کہیں مزار ہو۔ مگر چوبیس گھنٹہ کے اندر میری یہ حالت جاتی رہی۔

میں گھر پر تسنیم فاطمہ کو چھوڑ آیا تھا۔ اس کی عمر چار ساڑھے چار برس کی تھی۔ اس کی یاد اکثر آتی تھی۔ مجھے جہاز پر ایک لڑکی تسنیم کی ہم عمر مل گئی۔ یہ اپنی ایک بہن اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی مجھے اول تو بچوں سے یوں ہی بہت دلچسپی ہوتی ہے اور اس زمانے میں تسنیم کی یاد بیقرار کر رہی تھی۔ مجھے اس بچی سے بڑی وابستگی ہوگئی تھی۔ وہ بھی اس درجہ مانوس ہوگئی کہ دن کو اکثر میرے ہی پاس رہتی تھی۔ اس کا نام خدیجہ تھا اور اسے "بیوٹی" پیار میں کہتے تھے۔

یہ بچی جہاز پر اکثر میرے ساتھ رہتی اور لوگ مجھ سے دریافت کرتے تھے کہ کیا وہ میری بیٹی ہے۔ سفر ختم ہوا اور یہ واقعہ بھی یاد سے محو ہوگیا۔

تقریباً بیس سال بعد جب میں حیدرآباد میں صدر اعظم ہوکر گیا تو اپنے دوست نواب زین یار جنگ سے ملنے گیا۔ اس لڑکی کی بڑی بہن نے مجھے چق میں سے دیکھا اور پہچانا۔ نواب زین یار جنگ سے ذکر کیا۔ انھوں نے اس لڑکی کو مجھ سے ملایا۔ مجھے اس لڑکی سے دوبارہ مل کر بڑی ہی مسترت ہوئی۔ جب تک میں حیدرآباد رہا وہ برابر ہمارے گھر بالکل بیٹیوں کی طرح آتی تھی۔ میری بیوی کو بھی اس سے بہت تعلق ہوگیا تھا۔

باوجودیکہ سمندر کا سفر بہت ہی خوشگوار تھا لیکن ۴ اکتوبر کو یہ معلوم ہوکر کہ عدن پہنچیں گے مسترت ہوئی۔ بحر ہند کی موجوں کو دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا۔ ساحل کی طرف بے تابانہ نظر اٹھنے لگی۔ لیکن ہمارا جہاز بجائے چھ بجے شام کے ساڑھے دس بجے شب کو عدن پہنچا۔ میرے خیال میں تو اب کنارے پر جانے کا کوئی وقت نہ تھا لیکن میرے ہمسفر حضرات کی خواہش تھی اور مجھے اندیشہ تھا کہ میرے انکار پر شاید وہ حضرات بھی کنارے نہ جائیں، میں کنارے پر اترا۔ موٹر کرایہ

کر کے عدن کا چکر لگایا گیا۔ اول تو وہاں دیکھنے کو تھا ہی کیا۔ پھر رات کے بارہ بجے نظر بھی کیا آتا چاندنی رات میں موٹر کی سواری کا لطف اٹھا کر آ گئے۔

ارادہ تھا کہ عدن سے کچھ پان خریدیں لیکن اس کا موقع نہ ملا۔ تیسرے درجہ میں بعض ہم سفر بمبئی سے عدن تک آئے تھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا تو جتنے پان ان کے پاس بچے تھے سب ہم لوگوں کو دیدئے۔ ہم نے اس عنایت کو تشکر سے قبول کر لیا۔

میں انسانی محبت کے اس پہلو سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مجھے اس کی مسرت تھی کہ عدن میں پان نہ مل سکے۔

دوسرے روز عدن سے روانہ ہوئے۔ چونکہ یہ میرا پہلا سمندر کا سفر تھا ہر چیز جاذب توجہ معلوم ہوتی تھی۔ سمندر کے کنارے چھوٹی خشک پہاڑیاں تھیں جن پر درخت اور سبزے کا نام تک نہ تھا۔ یہ پہاڑیاں ماضی بعید میں ممکن ہے آتش فشاں رہی ہوں۔ سمندری پرند (سی گل) دن بھر جہاز کے ساتھ رہتے۔ سمندر میں اگر کوئی کھانے کی چیز ڈالی جاتی تھی تو یہ فوراً حصہ بخرہ کر لیتے تھے۔ ہمارا جہاز بحر احمر (ریڈ سی) میں جا رہا تھا۔

یہاں گرمی بہت سخت ہوتی ہے اور بڑی ہی بے لطف ہوتی ہے۔ حبس رہتا ہے۔ پسینہ خشک نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ سمندر تنگ ہے جہاز برابر نظر آتے رہتے ہیں۔ اس سمندر میں شارک مچھلیاں اور پورپس اکثر نظر آتی ہیں۔ پورپس بہت تیزی سے تیرتی ہیں۔ کبھی کبھی دور تک جہاز کے ساتھ کودتے چلے جاتے تھے۔

اس جہاز پر ایک انگریز لڑکی ہماری ہم سفر تھی۔ یہ لبرل پارٹی کے ایک ممبر پارلیمنٹ کی بیٹی تھی ہندوستان کی آزادی کی طرفدار تھی اور یہ بھی کہتی تھی میں پردہ پسند کرتی ہوں۔ ہندوستان کے بعض والیان ملک سے بھی واقف تھی۔ حسین و جمیل تھی۔ ناچتی بہت اچھا تھی۔ جب جہاز جدہ کے سامنے سے گذرا تو میں نے کوشش کی کہ دوربین ہی سے شاید جدہ دیکھ سکوں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ میرے مذہبی جذبات ارض مقدس کے قرب کی وجہ سے متاثر تھے۔ مجھے تاسف تھا کہ اب تک کیوں میں

فریضہ کی ادائیگی نہ ہوسکی۔ ساتھ امیر کا وہ مشہور شعر اپنے حسبِ حال پا رہا تھا۔

امیر جاتے ہو بُت خانے کی زیارت کو
ملے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا

خلیج سوئز کے قریب ایک روز اتنا خوبصورت غروبِ آفتاب دیکھا جو عمر بھر نہ بھول سکوں گا سمندر کے کنارے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن پر بادل تھا اور آفتاب بادلوں میں ہو کر غروب ہو رہا تھا۔ آفتاب کی شعاعیں کچھ بادلوں سے اوپر کی جانب اور کچھ نیچے کی جانب نکل رہی تھی۔ یہ عجیب منظر تھا۔ اوپر کی جانب تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاندی کے اوراق میں بجلی کی چمک ملا کر پھیلا دی ہے اور نیچے کی جانب سونا اور سمندر میں بجلی مل کر پھیلی ہے میں بہت دیر تک مبہوت اسے دیکھتا رہا۔ غروب آفتاب کے قریب شفق کی رنگینیاں اتنی دل کش اور جاذبِ نظر کبھی دیکھنے میں نہ آئی۔

ہم گیارہ اکتوبر کو نہر سوئز پر پہنچے۔ بندرگاہ میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ ادھر ادھر پہاڑیاں بے رونق۔ درخت اور سبزے کا نام و نشان نہیں۔ مجھے اس خدیو مصر کا خیال بار بار آیا کہ جس نے نہر سوئز کے حصص انگلستان کو فروخت کر کے مصر کی آزادی کو بیچ ڈالا۔

اس جہاز سے اٹھارہ انیس شخص قاہرہ کو روانہ ہوئے۔ ہم دو موٹروں میں روانہ ہوئے سوائے ریگستان اور ریت کے بڑے بڑے تودوں کے کچھ نہ تھا۔ سراب کا نام سُنا تھا۔ اس اسّی میل کے سفر میں اسے دیکھ بھی لیا۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی بھرا ہے لیکن جتنا موٹر آگے جاتا تھا یہ فریبِ نظر بھی اتنا ہی دور ہو جاتا تھا۔ اس ریگستان میں کوئی جانور نظر نہیں آیا۔ سوائے چند کوّوں کے جو غیر معمولی بڑے تھے۔ ہم سیدھے میوزیم پہنچے۔ یہاں دو دو تین تین ہزار برس کی پرانی چیزیں، زیورات، تابوت رکھے ہوئے ہیں جو پرانی مقبروں سے نکالے گئے ہیں۔ ان چیزوں کی موت کے ساتھ وابستگی نے کچھ ایسا اثر ڈالا کہ مجھے ہر چیز میں افسردگی معلوم ہوتی تھی۔ ممی کو کو دیکھنا یا کہیں رکھنا میرے نزدیک تو مذاقِ سلیم کے خلاف ہے جتنی دیر میں وہاں رہا

افسردہ ہی رہا۔ حالانکہ سونے کے زیورات، سونے کی تصویریں پتھر کے بت فراعین مصر کے زمانے کی بہترین صنعت کا نمونہ تھیں۔ ہوٹل میں لنچ کھایا اور پیرامڈ اور اسفنکس کو دیکھنے گئے۔ یہ بھی عجائبات عالم میں سے ہیں۔ پیرامڈ تو چوکور پتھروں کو اوپر تلے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ یہ قدیم مصر کے بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ اسفنکس ایک شیر کا بت ہے جس کا اوپر کا حصہ عورت کا ہے عقل کام نہیں کرتی کہ جب نہ اسٹیم کی طاقت میسر تھی اور نہ بجلی کی قوت تو پھر یہ لاکھوں ٹن پتھر کس طرح آیا ہوگا جس کا ایک ٹکڑا اسینکڑوں من کا ہے۔ اس پرانے زمانے کی تہذیب کی عجیب یادگاریں ہیں کہ جس دور کی تاریخ قصص وحکایات سے زیادہ اب کچھ بھی نہیں۔ میں بے حد متحیر اور اپنے خیالات میں کچھ عجیب طرح مستغرق تھا۔ مجھے اسفنکس ایک زندہ وجود معلوم ہوتا تھا جس نے ان تمام زمانوں کو دیکھا ہے۔ جو جانتی ہے کہ وہ کون عالی ہمت اور بلند حوصلہ اشخاص تھے کہ جن کے آثار کو زمانہ باوجود کوششوں کے آج تک نہ مٹا سکا۔ جو جانتی ہے کہ وہ ہزاروں مزدور کون تھے جن کی جانیں ان چٹانوں کو یہاں تک لانے اور ترتیب دینے کی نظر ہوئیں۔ واپسی پر چائے پی۔

چھ بجے کی ریل سے پورٹ سعید روانہ ہو گئے۔ راستہ میں مجھے اس یورپین لڑکی کی بات چیت سے یہ ظاہر ہوا گو صاف الفاظ میں نہیں کہ یہ غریب اپنے حسن و دماغ کے ذریعہ سے کسی دولت مند سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اسی فکر میں سرگرداں ہے۔

۱۳ اکتوبر کو خاں صاحب لیاقت خاں میرے پاس آئے اور بڑے اہتمام سے ایک پان دیا۔ یہ آخری پان تھا کہ جو عدن میں دیئے گئے تھے۔ انسان بھی کتنا عادتوں کا غلام ہو جاتا ہے۔ پان کے ختم ہونے کا ہم سب کو بہت احساس ہوا۔

دوسرے روز ہم یونان کے الجزائر کے قریب سے گزرے۔ میرے خیالات اسلام کے اس دور کی یاد میں محو ہو گئے جب یہ جزائر کی سلطنت کا ایک حصہ تھے۔ قوموں کے عروج و زوال کے فسانے جتنے دلچسپ اور سبق آموز ہیں اسی قدر دلگیر اور افسردہ بھی بناتے ہیں۔ جس طرح اشخاص ترقی و تنزل کا شکار ہوتے ہیں اور ایک کی غلطی سے دوسرا سبق آموز نہیں ہوتا اسی طرح اقوام بھی ابھرتی ہیں اور پھر

گر جاتی ہیں - اس کا احساس کہ یہ انقلاب کیوں ہوا بر وقت نہیں ہوتا - مورخین لکھتے رہتے ہیں - مثا
قانونِ قدرت یونہی ہے - کچھ ہی کہ دگر پستی و بلندی کے دور یونہی ہوتے رہتے ہیں - سمندر کا سفر
یونان سے آگے جاکر بہت دلچسپ ہو جاتا ہے - اکثر جزائر نظر آتے ہیں - جہاز ان سے اتنا قریب ہو
ہے کہ عمارتیں اچھی طرح نظر آتی ہیں -

اٹلی

آخر ۱۶ اکتوبر کو وینس کے بندرگاہ پر ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا - گینڈلے میں بیٹھ کر وکٹوریہ
آئے کسٹم افسروں نے ہمیں بالکل دق نہیں کیا - شاید حکومتِ برطانیہ نے اس کا انتظام کر دیا تھا
گول میز کانفرنس کے لوگوں سے وہی برتاؤ کیا جائے جو خارجی سفارت کے عملہ سے ہوتا ہے - یہ شہر
اپنی وضع میں یکتا ہے - گلی کوچوں میں سمینٹ کی سڑکوں کے بجائے سمندر - سواری فقط گنڈولا - نہ بڑے
شہروں کا گرد و غبار نہ شور - نہ موٹر کے ہورن کی آواز پریشان کرتی ہے اور نہ ٹریم کی گھنٹی سمع خراش
ہوتی ہے - کہیں کہیں موٹر بوٹ ضرور تھے - میرے خیال میں یہ اس شہر کی پرسکون فضا کو خراب کرتے
تھے - کہانیوں میں شہر خموشاں کا ذکر سنا تھا لیکن شب کو وینس واقعی شہر خموشاں ہو جاتا ہے -

یہاں شیشے کا سامان بے نظیر بنتا ہے - میں نے اتنا خوبصورت شیشہ کہیں کا نہیں دیکھا - ہم نے
کا سامان خریدا - چائے اور کافی پینے کے برتن بہت حسین تھے - میرے ساتھیوں کو بہت ہی جلد معلوم ہو
کہ یہاں کے لوگ پردیسیوں سے قیمت بہت زیادہ مانگتے ہیں - اصلی قیمت ٹھہرانے کے بعد طے ہوتی ہے
اس خاص معاملہ میں قاہرہ کے دوکاندار سب سے آگے ہیں - اصلی قیمت سے دو چند سہ چند طلب کرتے ہیں
میں نے کارخانے بھی دیکھے - یہ سب گھریلو کارخانے ہیں - چیزیں ہاتھ سے تیار کرتے ہیں اور
اور ہاتھ ہی سے اُن پر حسین نقش و نگار بناتے ہیں -

یہاں میں نے سینٹ مارک کا مقبرہ بھی دیکھا - کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
حواریین میں سے تھے - پرانے مصورین کی تصاویر کے بہترین شاہکار یہاں موجود ہیں لیکن تمام تصاویر
مذہبی تصاویر ہیں - مثلاً حضرت نوح کی کشتی - کبوتر کا درخت کی شاخ لیکر آنا - یہاں ہم نے ڈوجیز کے محل کو بھی

دیکھا۔ یہ بڑی تاریخی جگہ ہے۔ اٹلی کی تاریخ کے بہت سے اوراق ایسے ہیں کہ جنھیں اس محل سے خاص نسبت ہے۔ یہاں بہترین تصاویر کا مجموعہ ہے۔ میں نے بعض تصاویر کی نقلیں خریدیں۔ اس محل میں دو تصاویر پرانی وضع کے فوجی افسران کی ہیں۔ دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجسمہ ہیں حالانکہ فقط قلم کی صنعت ہے۔

اس گرجے اور محل کے سامنے بہت بڑا میدان ہے۔ یہاں ہزارہا کبوتر رہتے ہیں۔ انسان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ ہاتھوں پر آکر دانہ کھاتے ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے یہ میدان غلیظ رہتا ہے۔

یہ شہر ۱۱۷ جزیروں پر بسا ہوا ہے اور ۳۶۰ پل ہیں تاکہ پیدل چلنے والوں کو دقت نہ ہو۔

گرجوں کی عمارتیں بڑی شاندار ہیں۔ سلوٹے اور جیوسٹے کے گرجے دیکھے۔ سنگِ مرمر کا کام بے نظیر ہے لیکن مجھے آگرہ میں تاج محل کا کام زیادہ پسند ہے۔ ان گرجوں میں حضرت مریم کا مجسمہ اور دیگر اکابر دین کے مجسمے بہت خوب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں یہ شہر اپنی وضع کا ایک ہی ہے لیکن مجھے اس کی عمارتوں پر ایک افسردگی کا احساس ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شہر اپنا کام تاریخِ عالم میں ختم کر چکا ہو۔ ایک جسم تھا جس میں روح کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ شاید میں خود افسردہ خاطر تھا اس لئے مجھے ایسا احساس ہوا ہو۔ وینس سے جس روز ہم روانہ ہونے کو تھے، علی الصباح مسعود میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے کہ راؤ عبدالحمید خاں (مرحوم) سخت دردِ شکم میں مبتلا ہیں۔ میں کیا کہوں مجھ پر کیا گذری۔ اول تو مرحوم کی صحت اس زمانے میں یوں ہی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس سفر میں انھیں دانت میں بھی سخت تکلیف رہی تھی۔ اس پر درد کا دورہ پردیس میں بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ میں نے مسعود کو فروٹ سالٹ پلانے کی رائے دی۔ خود اپنے بکس سے کاسر یا چ دوائیں نکالیں۔ مگر جب میں دوائیں لے کر ان کے کمرے میں پہنچا تو عبدالحمید خاں (مرحوم) کا درد جا چکا تھا۔ ہم لوگ ۱۸ اکتوبر کو فلورینس کو روانہ ہوئے۔ کوکس کے ذریعہ سفر کا انتظام کیا تھا جو ہر طرح قابلِ اطمینان تھا۔ مجھے یورپ کے اس تھوڑے سے قیام میں اس فرق کا اندازہ جو ہندوستان اور یورپ کی تہذیب و تمدن میں ہے واضح طور پر ہوگیا تھا۔ یہاں کا رہن سہن آب و ہوا نظم و نسق کھیتی باڑی غرض ہر چیز میں بین فرق محسوس ہوتا تھا۔ لیکن سب سے

زیادہ فرق اقتصادی حالات کا فرق تھا۔ ان اقوام کی مالی حالت ہم سے بدرجہا بہتر ہے۔ جیسے سینکڑوں مفلس خانماں برباد ہمارے ہاں نظر آتے ہیں۔ یہاں شاید ہی کوئی ہوگا۔ ان کا معیار زندگی ہم سے بہت بلند ہے۔ یورپ میں مجھے دو باتوں کا بڑی سختی سے احساس ہوتا تھا۔ یورپین اقوام اور ہندوستانیوں کی مالی حالت کا فرق۔ دوسرے ان اقوام میں عام طور پر تنظیم جس طرح ہمارے یہاں بازاروں میں ریلوے اسٹیشن پر سینما کے دروازوں پر بڑبونگ اور نفسی نفسی ہوتی ہے وہ یہاں بالکل نہ تھی۔ ان اقوام میں بحیثیت قوم اور شخصی حیثیت سے بھی ڈسپلن ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ لوگ قانون کے ہم سے زیادہ پابند ہیں۔ ہمارے ملک میں اکثر لوگ قانون کی پابندی محض سزا کے اندیشہ سے کرتے ہیں لیکن جہاں موقع ایسا مل جائے کہ بغیر اندیشۂ سزا قانون شکنی ممکن ہو تو اکثر حضرات کو تامل نہ ہوگا۔ ظاہر ہے یہ ذہنیت حقیقی طور پر پابند قانون ذہنیت نہیں ہے۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا یورپ میں شہروں کے کوچہ و بازار ایسے بے فکروں اور بے کار لوگوں سے قریب قریب خالی ہوتے ہیں جیسے ہمارے بازاروں میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ لوگ دن بھر اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ہاں شام کو قہوہ خانہ اور ہوٹل بھر جاتے ہیں۔

میں ایک بار لندن میں ٹیکسی پر جا رہا تھا۔ ہم ایک ایسے چوراہے پر پہنچے جہاں برقی لالٹینوں کے ذریعہ کچھ دیر ایک طرف اور کچھ دیر دوسری طرف کا راستہ جاری ہوتا تھا یعنی لالٹین ہری اور سرخ ہو جاتی تھیں۔ جب ہم پہنچے تو لالٹین کا رنگ سرخ تھا۔ اس نے موٹر روک لیا۔ گو وہاں نہ کوئی پولیس والا تھا اور نہ کوئی سواری گزر رہی تھی۔ لیکن یہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک کہ لالٹین کا رنگ سبز نہ ہوگیا۔ اس مثال سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ لوگ قوانین کے کتنے پابند ہیں۔ ہم فلورینس پہنچے اور برکی ایلی ہوٹل (Berchie lli) میں ٹھہرے۔ یہاں کی Picture gellary (تصاویر کا ذخیرہ) بہت اچھا ہے۔ بعض پرانا مجسمہ اور تصاویر تو یونان سے روم آئے اور وہاں خاندان مچیٹھیا کے عروج کے زمانے میں یہاں لائے گئے۔ یہ تمام تصاویر یا تو پرانے یونانی قصوں پر مبنی ہیں یا انجیل اور توریت سے ماخوذ ہیں۔ یہاں حضرت مریم کی ایک مشہور عالم تصویر ہے۔ اس کو "نیلی مریم" اس وجہ

سے کہتے ہیں کہ چادر کا رنگ نیلا ہے۔ اس کی ایک کاپی میں نے بھی خریدی۔

۹ اراکتوبر کی صبح کو پھر راؤ عبدالحمید خاں کو درد کا دورہ ہوا۔ اس بار اتنا سخت درد تھا کہ ڈاکٹر بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی افیون کی پچکاری لگادی تب کہیں جاکر سکون ہوا۔ لیکن چونکہ اجابت نہیں ہوئی تھی ہم لوگ سخت پریشان تھے۔ پردیس میں ایسی علالت انتہائی پریشانی کا باعث ہوجاتی ہے۔ گھر کوسوں دور۔ وسوسوں کا ہجوم۔ کیا کہوں وہ دن کیسے گذرا۔ شام کو مرحوم کا نشہ کم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ درد رفع ہوگیا تھا تو جان میں جان آئی۔ ہم لوگ سیر کو گئے مگر دل عبدالحمید خاں مرحوم ہی میں پڑا تھا۔ جلد ہی لوٹ آئے۔ میں جو لوٹ کر کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مرحوم کے بستر کے قریب سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ میں یہ سمجھ کر شاید سگریٹ پی رہے ہیں۔ میرے سامنے وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے واپس ہونے لگا۔ نواب صاحب البتہ اندر چلے گئے۔ نواب صاحب کی آواز پر میں پلٹا تو دیکھا نواب صاحب بڑی بے تابی سے مرحوم کے بستر کی آگ بجھا رہے ہیں۔ ہوا یہ کہ مرحوم نے سگریٹ پی۔ افیون کے انجکشن کا اثر ابھی باقی تھا۔ کچھ دیر بعد پھر غافل ہوگئے اور سگریٹ بستر میں گری اور آگ لگ گئی۔ خدا نے خیر کی، چونکہ عبدالحمید خاں مرحوم کا درد رفع ہوگیا تھا۔ ہم لوگ شہر میلانو کو روانہ ہوئے۔ گہرا ابر محیط تھا اور ترشح ہو رہا تھا۔ یہاں ہم ڈ ی لورڈ ہوٹل میں ٹھیرے۔ صبح کو یہاں کا مشہور گرجا دیکھنے گئے۔ کیا خوب عمارت ہے! عجب نہیں یہ دنیا کا حسین ترین گرجا ہو۔ اس گرجے کے دروازے پر پیتل چڑھا ہوا تھا۔ جس پر حضرت مریم کی زندگی کے حالات تصویروں میں دکھائے ہیں۔ ایک جگہ حضرت عیسیٰ کا پیدا ہونا دکھایا ہے۔ زائرین بچّہ کے پاؤں کو تعظیماً چھوتے ہیں۔ اس جگہ کی پیتل گھس گئی ہے اور پاؤں کا حصّہ غائب ہونے کے قریب ہے۔ میں نے بھی چھوا۔ یہ ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ سنگِ مرمر سے بنائی گئی ہے۔ بہترین نقش و نگار ہیں۔ یورپ میں سنگِ مرمر کا کام اتنا خوبصورت میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ اس گرجے میں حضرت مریم کا ایک مجسّمہ ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ کو گود میں لئے کھڑی ہیں یہاں سینکڑوں لوگ روزانہ بیماروں کی شفا کے واسطے دعا کرنے آتے ہیں اور اس مجسمہ کے سامنے تین موم بتیاں جلا دیتے ہیں۔ پھر دعا کرتے ہیں۔ بیسیوں موم بتّی روشن تھیں۔ عقیدت مند گھٹنوں پر کھڑے

ہوئے مصروفِ دعا رہتے۔ یہاں کا رنگ دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ عیسائیوں میں دو فرقے کیسے ہو گئے جیسے ہندو دھرم میں مورتی پوجن کے خلاف آریہ سماج نے آواز بلند کی اسی طرح عیسائیت کے اس رنگ کا نتیجہ پروٹسٹنٹ فرقہ ہوا۔ مورتی پوجن اور یہاں کی عبادت میں کچھ فرق نہیں ہے۔

یہاں امرا کا ایک قبرستان بھی ہے جسے لوگ دیکھنے جاتے ہیں۔ میں تو دروازے ہی سے نظر ڈال کر ہٹ گیا۔ مجھے کچھ ایسا احساس ہوا کہ قبروں کا تماشا بنانا یا سیر کو جانا علاوہ غیر فطری حرکت ہونے کے اہلِ قبور کی بے حرمتی ہے۔ اس کے بعد یہاں سے ساڑھے دس بجے کی ریل سے ہم سوئٹزرلینڈ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں جھیل ماجری کے کنارے سے ریل گزرتی ہے۔ کیسا دل کش منظر تھا۔

سوئٹزرلینڈ

ریل جتنی اندرونِ ملک بڑھتی گئی گرد و پیش کا نظارہ ہمیں مسحور کرتا گیا۔ برف پوش پہاڑ کی چوٹیاں دامنِ کوہ میں سبزہ زار، چھوٹی چھوٹی ندیاں صاف و شفاف ایسا دلفریب اور جاذبِ نظر سین تھا کہ ہم لوگ دیوانہ وار اِدھر سے اُدھر کھڑکیوں سے آکر دیکھتے تھے۔ مہینہ اکتوبر کا تھا اس لئے خزاں کا رنگ پتّوں پر شروع ہو گیا تھا۔ بعض درختوں کے پتّے زرد اور سبز تھے اور بعض کے سُرخ۔ سورج کی شعاعیں کچھ اس طرح ان درختوں پر پڑ رہی تھیں کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ قوسِ قزح کے رنگوں سے پہاڑیوں کو رنگ دیا گیا ہے۔ یہ قدرتی مناظر اتنے دل کش تھے کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ ان کی تصویر ان سے حسین نہیں ہو سکتی۔ ہم سب کچھ اس درجہ متاثر تھے کہ یہ رائے قائم ہوئی کہ یہاں ایک مکان خریدا جائے ہم لوگ شام تک مونٹ رو (Montreaux) پہنچے۔ گولف ہوٹل میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ شہر جنیوا جھیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور حسین مناظر کا کیا کہنا۔ یہ ہوٹل جھیل کے کنارے ہے۔ کمرے کے دریچہ سے جھیل نظر آتی تھی۔ اس جھیل میں "سی گل" پرند بڑی کثرت سے ہیں۔ یہ پرند اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ دریچہ میں اگر روٹی کے ٹکڑے لے کر کھڑا ہو جائے تو یہ ہاتھ سے

ٹکڑے لے جاتے ہیں۔

دوسرے روز علی الصباح ایک چھوٹے جہاز سے ہم لوگ شہر جنیوا گئے۔ یہ شہر بھی اسی جھیل کے کنارے آباد ہے۔ اور اسی کے نام سے موسوم ہے۔ مونٹرو سے جنیوا تک سترہ اٹھارہ میل کا فاصلہ ہوگا۔ صبح کا وقت تھا کڑاکے کی سردی تھی۔ شب کو گرد و پیش کی چوٹیوں پر ہلکی سی برف باری ہوئی۔ ہمارے جہاز سے ڈر کر مرغابیاں اڑتی اور پھر کچھ آگے گر پڑتیں۔ اس جھیل میں ہر قسم کی مرغابیاں لاکھوں ہیں۔ سوان بھی بڑی کثرت سے اس جھیل میں رہتے ہیں۔ بارہ بجے کے قریب ہم لوگ جنیوا پہونچے اور ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کنارے پر سو ڈیڑھ سو "سوان" اکٹھے جمع تھے۔ میں نے ان کی تصویر لے لی۔ یہاں آکر صبح کی سردی کا اثر ہوا۔ کچھ بارش بھی ہو رہی تھی۔ مجھے زکام ہوگیا اور میں چار بجے کی گاڑی سے اپنے ہوٹل واپس آگیا۔

دوسرے روز بڑی ہی خوبصورت صبح طلوع ہوئی۔ شب کو ہلکی برف باری ہوئی تھی۔ برف ابھی درختوں پر موجود تھا۔ آسمان صاف ہو چکا تھا۔ سامنے جھیل۔ آبی پرند کثرت سے اڑتے پھرتے تھے۔ ہوٹل کے دریچہ سے میں دیکھ رہا تھا اور نظارہ میں ایسا گم ہو چکا تھا کہ ہوٹل کی ملازمہ ناشتہ لے کر آئی تو میں چونک پڑا شیلن کا قلعہ جھیل کے کنارے ہے اسے دیکھنے گئے۔ ہندوستان کے آثار قدیمہ دیکھنے کے بعد یہ عمارتیں آنکھوں میں نہیں سماتیں۔

پیرس

یہاں سے ۲۳ راکتوبر کو ڈیڑھ بجے دوپہر کی گاڑی سے چل کر ساڑھے دس بجے رات تک پیرس پہنچے۔ یہ Bourgogne et Montana ہوٹل میں ٹھیرے۔ راہ میں مختلف پرند دیکھے جو ریل سے نظر آئے۔ انھیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یورپ میں جنگلی جانوروں کا قریب قریب قصہ ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں غول در غول جنگلی چرند و پرند پائے جاتے ہیں۔ یورپ میں سوائے شکارگاہوں یا ان رقبات کے جو جانوروں کے واسطے محفوظ کئے گئے ہیں جنگلی چوپائے تو ہیں ہی نہیں اور پرند بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔

میں یہ خیال کرتا رہا کہ زیست کی کش مکش ہر رنگ کمزور کو مٹاتی جاتی ہے اور زبردست دنیا پر قابض ہوتا

جاتا ہے۔ جب انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو یونہی جنگل ختم ہو گئے اور کھیتی باڑی کی حفاظت کے سلسلہ میں جانوروں کو مجبوراً ختم کرنا پڑا۔ یہی حالت اقوام کی ہے۔ طاقتور اقوام کمزور قوموں کو مٹا رہی ہیں۔ زبان سے انصاف اور مساوات کے بڑے بڑے اصول بیان کئے جاتے ہیں۔ کمزور ان امید افزا الفاظ پر اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو انہی الفاظ کے معنی کچھ اس طرح بدلے جاتے ہیں کمزور منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ پھر مجھے اپنا ملک یاد آتا رہا اور بالکل ایک متضاد خیال نے دماغ کو گھیر لیا۔

دوسرے روز پیرس کی سیر کی۔ اس شہر کی آرائش۔ دوکانوں کی سجاوٹ اور روشنی بے مثل ہے ہر شب کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ تصویروں کا عجائب خانہ قابلِ دید ہے۔ اس میں اس قدر تصاویر اور مجسمے ہیں کہ ان کی سیر کو ہفتوں درکار ہیں۔

یہاں کے تھیٹر بہت عجیب و غریب ہیں۔ کھانے کے بعد ہم لوگ تھیٹر میں گئے۔ اتنا نفیس تماشا اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تمام اسٹیج بقعہ نور بن رہا تھا۔ ایک جگہ طوفان اس خوبی سے دکھایا تھا کہ میں متحیّر رہ گیا۔ تیز ہوا کے جھونکے اسٹیج پر۔ درختوں پر طوفانی کیفیت پیدا کر رہے تھے بجلی کی چمک اور کڑک۔ بادلوں کا تیز ہوا میں اڑنا۔ دریا میں تموج۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ حقیقتاً ایک طوفان برپا ہے۔

اسی طرح سے ایک حصہ نیلا ڈینوب کے نام سے دکھایا تھا۔ میلوں دریا بہتا معلوم ہوتا تھا سبزی اور نیلاہٹ میں اس طرح کی چمک تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ بس ایک دل کش خواب معلوم ہوتا تھا۔ یہاں کے تماشوں میں کپڑے کے استعمال میں تخفیف اکثر مدِ نظر ہوتی ہے۔ یہاں یہ مشہور ہے کہ پیرس رات کے بارہ بجے بیدار ہوتا ہے۔ شب کو قہوہ خانوں میں لوگوں کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ بیان سے باہر۔ یہاں قہوہ تو شاید ہی کوئی پیتا ہو۔ بقول غالب "بادہ ہائے گوارا" اور "نازنینِ بتانِ خود آرا" کی کارفرمائی رہتی ہے۔

یہ نظارہ جس قدر نیا اور دلچسپ تھا اتنا ہی فکر انگیز بھی تھا۔ خیال آتا تھا کہ جو قوم عیش و نشاط کی اس درجہ دلدادہ ہو چکی ہو وہ زندگی کی آزمائشوں سے کیسے عہدہ برآ ہو سکے گی۔

کیا ایسے لوگوں میں قربانی کا کوئی مادّہ باقی رہ سکتا ہے۔ کیا وقت ضرورت یہ لوگ اپنی اس پُرکیف زندگی کو یکایک خیرباد کہہ سکیں گے۔ کیا اس قدر پُرلطف زندگی کی محبّت انھیں موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے دیگی۔

یہاں سلطان مراکو نے ایک مسجد بنوائی ہے۔ بہت خوبصورت اور قابلِ دید عمارت ہے۔ نپولین کا مقبرہ بھی دیکھا۔ جہاں اس کی ہڈیاں لاکر رکھی گئی ہیں۔ بڑی عالی شان عمارت ہے۔ ایفل ٹاور بھی دیکھا۔ یہ آہنی مینار دنیا کا بلند ترین مینار خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی بلندی نوسو فیٹ ہے۔ ۲۶ر اکتوبر کی شام کو ہز ہائی نس آغاخان کے ہاں چائے پینے کا اتفاق ہوا۔ سیاسی موضوعات پر دوران گفتگو میں فرمانے لگے کہ وہ ہر خدمت کے لئے تیار ہیں اور مسلمانانِ ہند کی ترجمانی کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔

۲۷ر اکتوبر کو پیرس سے روانہ ہوکر کیلے پر انگلش چینل کو عبور کیا۔ کسٹم پر ہم لوگوں کو کوئی دقت نہیں ہوئی۔ گورنمنٹ کے احکامات تھے کہ ہمارے اسباب نہ دیکھے جائیں۔ انگلستان پہنچکر اس حیثیت سے بڑی تفریح ہوئی کہ ایک ایسے ملک میں آگئے جہاں کی زبان سمجھ سکتے تھے۔ سوائے سوزرلینڈ کے جہاں کئی زبانیں بالعموم بولی جاتی ہیں اور ہر جگہ عجیب مجبوری کا احساس ہوتا تھا۔ گو ہمارے ساتھ اسکوٹ اور کونر تھے۔ مگر ان کی فرینچ بھی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ اہلِ زبان مشکل سے سمجھتے تھے۔ مترجم سے کام چلانا اور بات ہے مگر کسی ملک میں پہنچکر وہاں کی زبان نہ سمجھنا بڑی ہی بےبسی ہے!

مجھے کسی نے اس سفر میں ایک مزاحیہ قصّہ زبان نہ جاننے کے سلسلے میں سنایا۔ قصّہ یہ ہے کہ ایک صاحب کسی ملک میں پہنچے۔ زبان سے ناواقف تھے اور اسٹیشن پر جانا چاہتے تھے۔ موٹر والے کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اس کی سمجھ میں ان کا منشا نہ آیا۔ آخرکار سیاح نے مجبور ہوکر ایک نیا طریقہ اظہار منشا کا اختیار کیا۔ وہ فوراً چاروں ہاتھ پاؤں سے بچوں کی طرح زمین پر چلنے لگے اور اوپر کو منہ اٹھاکر ایک چیخ لگائی اور بھک بھک منہ سے آواز نکالنے لگے۔ موٹر والے نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ وہ ان کا منشا سمجھ گیا اور یہ خوش خوش موٹر میں سوار ہوگئے۔ سیّاح صاحب اس پر مسرور تھے کہ انھوں نے زبان کا کام اپنے نرت سے نکال لیا۔ اب موٹر ایک عالی شان عمارت کے سامنے رُکا ہے یا ٹھہر گئے۔ وہاں کوئی شخص

ایسا مل گیا جو ان کی زبان جانتا تھا اس نے بتایا کہ عمارت پر جلی حروف میں "پاگل خانہ" لکھا تھا۔

انگلستان

شام تک لنڈن پہنچے اور ہائیڈ پارک کے قریب الگذنڈا ہوٹل میں ٹھہرے۔ وہاں حافظ ہدایت حسین مرحوم۔ راجہ اور رانی بشیشر دیال سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر دت نے جو گول میز کانفرنس کی طرف سے مہمان نوازی پر مقرر تھے) پارلیمنٹ کے افتتاح کا ٹکٹ دیا۔ ۲۸ اکتوبر کو میں پارلیمنٹ کا افتتاح دیکھنے گیا۔ ہم لوگوں کو پیرس گیلری میں بلایا گیا تھا۔ وہاں سے بادشاہ اور بادشاہ بیگم گذریں۔ پورا شاہی لباس زیب تن اور متوسلین جلو میں تھے لیکن شاہی تقریر سننے کا موقع نہ ملا۔

شام کو درزی کے ہاں پہنچکر کپڑے سلوائے۔ گو ہندوستان میں مجھے انگریزی لباس سے کچھ بہت ذوق نہ تھا۔ سوائے شکار یا ٹینس کے میں انگریزی کپڑے پہننے کا عادی نہ تھا۔ لیکن ولایت میں روزانہ زندگی ہندوستانی کپڑوں میں گذارنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ ہر ملک کا لباس وہاں کی آب و ہوا کے مطابق ہوتا ہے۔ ہندوستانی لباس یہاں خاصکر موسم سرما میں بہت غیر موزوں ہے۔ تماشا دیکھنے کا شوق تو قدرتی خواہش ہے مگر تماشا بن جانا تو بہت ہی گراں ہوتا ہے۔ جس طرف جائیے لوگ غور سے دیکھتے ہیں۔ پھر ہندوستانی لباس کی بدولت خواہ مخواہ "پورہا ہینس" بنا دیا جاتا ہے۔ گو "یورہائینس" کا خطاب انگریزی لباس کے باوجود ملتا رہتا ہے۔ مجھے اس سے خاص چڑ تھی اور ہمیشہ اس غلط فہمی کی اصلاح کرتا تھا۔ یورپ میں ہر ہندوستانی کو ہائینس سمجھا جاتا ہے اور اس وجہ سے اکثر دشواریاں ہو جاتی ہیں۔

انگلستان میں اس زمانے میں مزدور گورنمنٹ تھی اور مسٹر وَیج ۔ وڈ بین وزیر ہند تھے۔ کنسرویٹو لوگ وزیر ہند کو عظمت و عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ میں ۴ نومبر کو ملک عمر حیات خاں ٹوانہ مرحوم سے ملا تو وہ ہر ترقی کے مخالف تھے۔ وہ کسی ایسی تبدیلی کو جو انگریزی حکومت کے اختیارات کو کم کرے پسند نہ کرتے تھے۔ اسی روز سر فرینک براؤن اور سر مائیکل اوڈوائر سے لینچ پر ملنا ہوا۔ یہ لوگ Law & Order

کے منتقلی کے خلاف تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ آگے بڑھنا ضروری ہے۔ بہرحال قدامت پسند پارٹی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ Law & Order کسی طرح بھی منتقل نہ کیا جائے۔ مجھے ہر موقع پر ان حضرات سے کہنا پڑتا تھا کہ پُرانی پالسی نہ اب ہندوستان کے واسطے مفید ہے اور نہ انگلستان کے واسطے۔ ۴ر نومبر کو دس بجے وزیر ہند سے ملا۔ یہ بہت متواضع اور خلیق آدمی ہیں، دل سے چاہتے ہیں کہ کانفرنس کامیاب ہو۔ تقریباً چالیس منٹ تک ہندوستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اُن سے کہا کہ مسلمانانِ ہند ترقی کے خلاف نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ حکومت خود اختیاری مل جائے۔ مگر اسی کے ساتھ ایسے تحفظات بھی ہوں کہ خود مختار حکومت کے بعد اکثریت اگر تنگ نظر ہو جائے تو انھیں تکلیف نہ پہنچا سکے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اصل دشواری یہ ہے کہ اگر سیاسی اختلاف ہو تو آج قوم اگر ایک پارٹی کے ساتھ ہے تو کل دوسری جماعت کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ آج مزدور جماعت سب سے بڑی پارلیمنٹ میں ہے۔ آئندہ انتخاب میں ممکن ہے کہ مزدوروں کی کامل اکثریت ہو جائے۔ ممکن ہے کہ یہ تعداد بھی نہ رہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمان کی دشواری یہ ہے کہ وہ کسی بھی سیاسی پروگرام کو اختیار کرے ہمیشہ اقلیت ہی میں رہے گا اس وجہ سے اسے تحفظات کی ضرورت ہے۔

۵ر نومبر کو میں لارڈ ہیلشم اور ارل ونٹرٹن سے ملا۔ یہ قدامت پسند جماعت کے حقیقی نمائندے ہیں وہ مسلمانوں کو تحفظات دینے کو تیار ہیں مگر ہندوستان کی آزادی کے خلاف ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قدامت پسند حضرات کو مسلمانوں کے تحفظات کے مطالبہ سے ہمدردی اس وجہ سے بھی تھی کہ ایسا مطالبہ جمہوری حکومت کے ساتھ قانون میں رکھنا آسان نہ تھا۔ اگر تحفظات قانون میں رکھے جائیں تو اس کا ضامن کون ہو کہ ان پر عمل بھی ہو گا۔ اگر اکثریت ایسے تحفظات کو پس پشت ڈال دے تو اسے کون مجبور کر سکتا ہے۔ اگر یہ کسی باہر کی طاقت پر منحصر ہو تو اس حد تک ہندوستان کی حکومت کی خود مختاری نامکمل ہو گی۔ ان حضرات کو ایوانِ اعلیٰ کی تجویز سے بھی اتفاق تھا۔

شام کے وقت گول میز کانفرنس کی ایک سَب کی میٹنگ تھی جس میں وزیر ہند موجود تھے۔ کانفرنس کا طریقہ کار Procedure تجویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں مسٹر جناح۔ سر تیج بہادر سپرو

سر محمد شفیع۔ مسٹر شاستری اور ایک دو اور حضرات تھے۔

پہلے روز کے لئے مسٹر جناح اور شاستری مقرر تجویز کئے گئے۔

سر فنلیٹ اسٹیوارٹ سے ملا۔ یہ وزیر ہند کے مستقل سکریٹری تھے۔ بہت سمجھدار اور ہندوستان کے حالات و معاملات سے باخبر تھے۔ علاوہ Law & Order کے ایک دوسرا مضمون جو ولایت میں بہت اہم سمجھا جاتا تھا وہ فوج کا سوال تھا۔ سائمن کمیشن فوج کو ہندوستانی اقتدار سے قطعاً باہر رکھنا چاہتی تھی اس مسئلہ پر سر فنلیٹ نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا کہ یہ بہت ہی دلچسپ بات ہوگی ایک طرف فوجی معاملات میں ہمیں دخل نہ ہو اور دوسری طرف کہا جائے کہ تم اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتے وہ اسے مانتے تھے کہ فوجی معاملات میں بھی ہندوستانیوں کو اختیار دینا ہوگا۔

مجھے ایک روز مسٹر ڈاسن انجہانی نے اپنے گھر لنچ پر بلایا۔ مارکوئیس لوتھین اور آنریبل اولیور سٹینلی بھی موجود تھے۔ یہ دونوں حضرات لبرل اور کنسرویٹو پارٹی کی طرف سے کانفرنس پر تھے۔ بہت اچھی صحبت رہی۔ یہ دونوں حضرات نہایت ذی ہوش خوش فہم اور قابل تھے۔ ذمہ دار عہدوں پر رہے آنریبل اسٹینلی تو کیبنٹ کے ممبر بھی رہے۔ گفتگو کا رنگ پولیٹکل نہ تھا۔ لیکن میں نے یہ ضرور ظاہر کر دیا کہ مجھے لارڈ ارون کی پالسی سے اتفاق ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں کی بہتری اس میں ہے کہ ہندوستان کو خود مختار حکومت کی طرف بڑھنے میں مدد دی جائے۔ سیاسی لحاظ سے اقلیتوں خاصکر مسلمانوں کی پوزیشن گول میز کانفرنس میں اسی لحاظ سے بڑی دشوار تھی کہ وہ ایک طرف تو ہندوستان کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ دوسری جانب انھیں اس کا یقین نہ تھا کہ اکثریت ان کے ساتھ کامل خود مختاری کے بعد بھی انصاف، وسعت نظر اور رواداری برتے گی۔ انھیں اس کی فکر تھی کہ آئندہ قانون میں ان کی حفاظت کا کافی لحاظ رکھا جائے۔ ایک بار ایک میٹنگ مسلمان ممبران کی ریٹز ہوٹل میں ہو رہی تھی۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کی پوزیشن کے متعلق یہ الفاظ کہے۔

'Gentlemen, the position is, Hindu wants Suraj, you want safe-guards."

حضرات صورتِ حال یہ ہے کہ ہندو حکومت خود مختاری چاہتے ہیں اور آپ "تحفظات"
مسلمان کا نقطۂ نظر میری دانست میں یہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل جائے لیکن چونکہ تعداد میں کم ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ قانون میں تحفظات ہوں تاکہ جدید طرزِ حکومت میں اسے بھی احساس آزادی اور خود مختاری ہو۔ نئے نظام کی بنیاد پارلیمنٹری طرزِ حکومت پر ہو سکتی تھی جس میں فیصلہ کثرت رائے پر ہوتا۔ مسلمان اس رائے شماری سے غیر مطمئن ہو کر تحفظات چاہتا تھا۔ مگر قدرتاً ایسے تمام تحفظات خود مختاری میں کسی نہ کسی حد تک کھنڈت ڈالتے ہیں۔ یہ مسلمان کا دردِ سر تھا۔
ہندوستان کے نمائندہ حضرات کے لیڈر ہز ہائی نس آغا خان ہوئے۔ ابھی تک فرقہ وارانہ ذہنیت میں اتنی رواداری تھی کہ آغا خان متفقہ طور پر لیڈر بنائے جا سکے۔

دوسری دشواری ہندوستان کی خود مختاری کے راستہ میں والیانِ ملک کا وجود تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے ملک کی حکومت جہاں اتنی زبانیں بولی جاتی ہوں اتنے مذاہب ہوں اور اس قدر مختلف خیالات کی اقوام رہتی ہوں فیڈرل نوعیت کی حکومت ہی ہو سکتی تھی۔ لہذا یہ ہی متفقہ طور پر طے پایا کہ طرزِ جدید کی بنیاد فیڈریشن پر ہو۔ اس پر والیانِ ملک راضی ہو گئے۔ ان لوگوں کو راضی کرنے میں سر تیج بہادر سپرو آنجہانی اور رائٹ آنریبل جیکر کا بڑا ہاتھ تھا۔

والیانِ ملک میں مہاراجہ پٹیالہ آنجہانی۔ مہاراجہ بیکانیر آنجہانی اور ہز ہائی نس بھوپال نے اس میں خاص حصہ لیا۔ ان حضرات نے سب سے پہلے اپنی رضامندی دے کر فیڈرل اسکیم کو قابلِ عمل بنا دیا۔ والیانِ ملک کی رضامندی سے ایسے لوگوں کو جو ہندوستان کی ترقی کے خواہش مند تھے اطمینان ہوا۔ لیکن اس کا اثر مختلف طبقات میں یکساں نہ تھا۔ ہندوستان میں عام طور پر اسے اچھی نظر سے دیکھا گیا۔ ولایت میں لیبر حکومت اس سے مطمئن تھی۔ کنسرویٹو متحیر تھے۔ لبرل گو برائے نام رہ گئے تھے مگر وہ بھی مطمئن تھے۔

والیانِ ملک کا یہ فیصلہ گو آخر تک قائم نہ رہا لیکن گول میز کانفرنس میں اس سے ضرور مدد ملی۔
پہلی گول میز کانفرنس کے چند ہی ماہ کے بعد پرنسس نے اپنی رائے بدل دی۔ جہاں تک میرا خیال ہے

وہ پوری طرح اس کے نتائج کو سمجھ نہ سکے تھے۔ پرنسس کے ذہن میں فقط یہ خیال تھا کہ وہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی مداخلت سے کسی حد تک نجات پا جائیں گے۔

ان کے نامزد کئے نمائندے دہلی کی اسمبلی میں ہوں گے اور اس طرح پرنسس خود بڑی حد تک مرکزی حکومت کو متاثر کر سکیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا خیال یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ دہلی کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ انھیں ناچ نچائے خود دہلی ان کے زیر اثر ہوگی۔ جب اس کی تفصیلات سامنے آئیں تو حالات کا صحیح اندازہ ہوا۔ سب سے پہلے کانگریس نے یہ کہا کہ ریاستوں کے نمائندے انتخاب سے ہوں۔ والیانِ ملک کو نامزدگی کا اختیار نہ ہو۔ یہی مسلم لیگ کا بھی خیال تھا۔ والیانِ ملک کی رعایا خود بھی اسی کی طالب تھی کہ نمائندے بذریعہ انتخاب ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ پرنسس کو جلد ہی اس کا یقین ہو گیا کہ ایک جمہوری نظامِ حکومت کے ساتھ شخصی خودمختار حکومت کا ہونا ناممکن ہے۔ اب ان والیانِ ملک نے جو پہلے شامل ہونے کا وعدہ کر چکے تھے کسی نہ کسی بہانے سے ہٹنا شروع کیا۔

وزراء میں سے سر اکبر حیدری مرحوم حیدرآباد کی طرف سے گئے تھے اور سر مرزا اسماعیل میسور کی طرف سے۔ سر مرزا کو تو چنداں دقت نہیں ہوئی۔ مہاراجہ میسور کامل طور پر سر مرزا پر بھروسہ کرتے تھے اور اس پر راضی ہو گئے کہ میسور فیڈریشن میں شریک ہو جائے۔ لیکن سر اکبر کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف حکومتِ ہند کو یقین دلایا تھا کہ وہ حیدرآباد کو شامل کرا دیں گے۔ دوسری جانب نظام نے صاف صاف انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے باہمی تعلقات میں بدمزگی ہوئی اور آخرکار سر اکبر کو حیدرآباد سے ۱۹۳۶ء میں چھوڑنا پڑا۔ اگر حکومتِ ہند ان کی مدد نہ کرتی تو شاید ان کو اس سے پہلے ہی علیحدہ ہونا پڑتا۔

اسی زمانے میں ایک قصہ سنا گیا۔ راوی کا نام یاد نہیں آتا لیکن اتنا یقین ضرور ہے کہ وہ ذی علم اور ذمہ دار شخص تھا۔

شہنشاہ معظم فیڈریشن پر راضی تھے۔ بتایا یہ جاتا تھا کہ شاہ جارج پنجم ہندوستان میں خودمختار حکومت پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کا نظریہ وہی تھا جو اس زمانے میں کنسرویٹو پارٹی کا تھا یعنی ہندوستان

خود مختار حکومت کا بار سنبھالنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ لہٰذا وہ فیڈریشن کی تجویز کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔
ایک دن حضرت میکڈانلڈ نے جو وزیراعظم تھے۔ اُن سے کہا کہ فیڈریشن کا ایک نفع یہ بھی ہے
کہ والیانِ ملک کی ریاستوں کا رقبہ قانوناً برٹش انڈیا کا حصہ نہ تھا۔ فیڈریشن کے بعد قانوناً
وہ بھی برٹش انڈیا میں شامل ہو جائے گا۔ نیز خود مختاری کا یہ بہترین توڑ ہے اس واسطے کہ فیڈریشن
کی بنیاد معاہدوں پر ہوگی۔ پھر اس سے کوئی نکل نہ سکے گا۔ راوی کا بیان تھا کہ اس تفسیر کے بعد
بادشاہ کو اس تجویز سے کوئی اختلاف نہ رہا تھا اور اکثر وزیراعظم سے دریافت کرتے تھے کہ اس تجویز
کے سرسبز ہونے کے امکانات کیا اور کتنے تھے۔

میں اکثر ممبرانِ پارلیمنٹ کو کھانے پر بلاتا تھا اور ہندوستان کے مستقبل کے متعلق گفتگو ہوتی تھی
ہاؤس آف کامنس میں ممبران مجھے بلا لیتے تھے۔ وہاں ڈنر کے بعد اسی مسئلہ پر گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی سیاسی
پارٹیوں کے لوگ لنچ یا ڈنر پر مدعو کر لیتے تھے۔ ایسے لنچ اکثر ان پارٹیوں کے کلب میں ہوتے تھے۔ ہر موقع
پر زیرِ بحث وہی ایک مسئلہ ہوتا تھا یعنی ہندوستان کا مستقبل۔

میرا خیال ہے کہ مختلف سیاسی جماعتوں کے ممبروں سے بیک وقت گفتگو کرنا کچھ سودمند نہیں ہوتا
اس لئے بذاتِ خود میں مختلف جماعتوں سے الگ الگ گفتگو کرتا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا چنداں اثر نہ تھا۔ ایک دوسری جماعت مسلم آل پارٹیز
کانفرنس کے نام سے وجود میں آئی تھی۔ یہ جماعت ہز ہائی نس آغا خان کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔ مسلمانوں
کی سیاسی رہنمائی اسی جماعت کے ہاتھ میں تھی۔ مسلم کانفرنس نے چودہ پوائنٹ مسلمانوں کے تحفظ میں قائم
کئے تھے جنھیں مسٹر جناح نے بھی مسلم لیگ کی طرف سے منظور کر لیا تھا۔ جو عام طور پر مسٹر جناح کے چودہ پوائنٹ
کے نام سے مشہور ہوئے۔

صوبجات کی کمیٹی

صوبجات کی حکومت کا نقشہ بنانے کے لئے جو کمیٹی بنی تھی اس کا ایک ممبر میں بھی تھا۔ اس کمیٹی میں

یہ تو فوراً طے ہوگیا کہ صوبجات میں پوری ذمہ دارانہ حکومت دی جائے لیکن اس پر بحث تھی کہ تحفظات مسلمانوں کے واسطے کیا ہوں اور وزارتیں کیسے بنائی جائیں۔ اس پر اتفاق تھا کہ اقلیت کی نمائندگی وزارت میں ضرور ہو۔ اگر قانون میں شامل ہو سکے تو فبہا ورنہ گورنر جنرل اور گورنروں کو جو ہدایات دی جائیں اس میں اس کی تصریح کر دی جائے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ خود مختار پارلیمنٹری حکومت میں تحفظات نقیض پیدا کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال بدیہی وزارت کا تقرر ہے۔ فرض کیجئے جو پارٹی اکثریت میں ہے اس میں کوئی مسلمان نہ ہو۔ وزارت اب کیسے بنے۔ اگر گورنر یا گورنر جنرل مجبور کرتا ہے کہ دوسری کسی پارٹی سے مسلمان لئے جائیں تو پارلیمنٹری حکومت کے خلاف ہوتا ہے۔ یعنی بجائے وزیر اعظم کے گورنر کو ممبران گورنمنٹ کے تقرر میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے اس دشواری کا پورا احساس تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارے ملک کے حالات وہ نہ تھے جو برطانیہ اور دوسرے یورپین ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان میں مخلوط حکومتوں کا بننا مفید ہی ہوتا۔ بشرطیکہ اکثریت بھی اس اصول کو دل سے مان لے اور دیانت سے اس پر عمل کرے اور اس کی کوشش کرے کہ یہ طرز حکومت کامیاب ہو۔ ورنہ یہ دشواری ہو سکتی ہے کہ اکثریت نے اصول کو نہ مانا اور گورنر نے اصرار کیا تو اس نے حکومت بنانے سے انکار کیا۔

واحد پارٹی حکومت

میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کافی عرصہ تک ہندوستان کے لئے کسی ایک سیاسی جماعت کی حکومت مفید نہ ہوگی۔ اگر مشترکہ حکومت ہوگی تو ہر جماعت کے بہترین اشخاص آسکیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ پارٹی کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ لیکن ملک میں جو اطمینان اور بھروسہ مشترکہ گورنمنٹ پر ہوگا وہ فقط ایک پارٹی کی حکومت پر نہیں ہو سکتا۔ مخلوط یا مشترکہ گورنمنٹ میں قدرتاً مختلف خیال کے لوگ ہوتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ پارٹی کا اصلاحی پروگرام مخلوط حکومت میں اتنی سرعت اور طاقت سے نہیں چلتا جتنا ایک پارٹی کی حکومت میں چلتا ہے۔ لیکن کیا ملک کے واسطے یہ بہتر نہیں کہ اصلاحات کی رفتار دھیمی

کم ہو لیکن لوگوں کو حکومت پر بھروسہ ہو اور دلوں میں اطمینان ہو۔ میرا تجربہ یہ بھی ہے کہ جب کسی حکومت میں مختلف الخیال لوگ ہوتے ہیں تو گورنمنٹ کی میٹنگ میں کبھی کبھی کافی تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ مباحثہ میں وقت ضائع ہوتا ہے۔ بایں ہمہ فیصلہ ایسا ہوتا ہے جسے ملک کا ہر چھوٹا بڑا پسند کرے یا نہ کرے برداشت ضرور کر لیتا ہے۔

۱۹۳۱ء کے جنرل الیکشن کے بعد انگلستان میں مخلوط حکومت بنائی گئی ہے جسے نیشنل گورنمنٹ کہا گیا کنسرویٹو کی بڑی اکثریت تھی لیکن اپنی تعداد کی زیادتی سے نفع اٹھانے کے بجائے انھوں نے مخلوط حکومت کی بنیاد رکھی اور رمزے میکڈانل کو وزیر اعظم بنایا۔ انگلستان میں نیشنل حکومت تقریباً پندرہ برس جنگ کے آخر تک قائم رہی۔ اگر انگلستان کے لئے یہ مناسب تھا تو پھر ہندوستان کے لئے تو شروع شروع خود مختار گورنمنٹ میں یہ ضروری تھا۔

اس کمیٹی نے یہی سفارش کی جہاں تک ہو سکے گورنر اس کی کوشش کرے کہ اقلیتوں کے نمائندے گورنمنٹ میں شامل کئے جائیں۔

اخباروں کی سوشہ بازی

۶ دسمبر کو حافظ ہدایت حسین نے مجھے ٹیلیفون پر کہا کہ آپ نے ڈیلی ٹیلیگراف دیکھا۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حافظ صاحب مرحوم کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ اس میں کچھ ایسا لکھا ہے کہ موجودہ حکومت ہندوؤں کی طرفدار ہے اور لبرل اور کنسرویٹو مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اس سے خواہ مخواہ مسلمانوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ ارل رسل شاید نائب وزیر ہند تھے۔ کیمبرج سے واپس ہوتے ہوئے ریل میں میرے ہمسفر تھے میں نے اُن سے تذکرہ کیا تو کہنے لگے کہ ہمارے دشمن ایسی بے بنیاد خبریں مشہور کرتے ہیں۔ تاہم ۷ دسمبر کے ٹائمس میں اس کی تردید شائع ہوئی۔ اخبارات اس قسم کے سوشے ہندوستان میں بھی چھوڑتے رہتے ہیں۔

۹ دسمبر کو ساڑھے نو بجے رٹینر میں مسلمانوں کی میٹنگ ہوئی۔ کہا یہ گیا تھا کہ مسٹر جناح اور چند ہندو صاحبان وزیر اعظم سے ملے اور ہندو حضرات نے اُن سے یہ خواہش کی کہ وزیر اعظم بحیثیت پنچ ہندو مسلم قضیہ

کو طے کر دیں مسلمان وزیر اعظم سے کچھ بدگمان تھے۔ اس واسطے اس ثالثی سے گھبراتے تھے لیکن صاف صاف یہ کہنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ بہت کچھ گفت وشنید کے بعد یہ طے پایا کہ دونوں طرف کے نمائندے خود صلح کریں اور اگر ہندو مسلمانوں کے تیرہ پوائنٹ مان لیں تو آخر کے پوائنٹ جداگانہ انتخاب کے حق کو چھوڑ دیا جائے اور محمد علی مرحوم کا فارمولا مان لیا جائے۔

۱۰ دسمبر کے روزنامچہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگ وزیر اعظم کے ہاں جمع ہوئے اور ہندو مسلمان قضیہ پر گفتگو رہی۔ سپرو نے مسلمانوں کی اتنی طرفداری کی کہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔

اس روزنامچہ میں اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جسے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ سرتیج بہادر سپرو نے ڈاکٹر مونجے آنجہانی کے جواب میں کہا کہ مسلمان گوشت خور ہیں تم خور نہیں جو ہندوؤں کو کھا جائیں گے۔ میں نے سرتیج بہادر کا بہت شکریہ ادا کیا۔ مسلمانوں کی اس طرفداری کی بدولت اکثر ہندو ممبران کو ان سے شکوہ ہو گیا۔ لیکن وہ ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے اور ہر ایسی دشواری کو جو آزادی کی راہ میں حائل ہو ہٹانا چاہتے تھے۔

میں نے سیموئیل ہور۔ جنرل نوکس۔ مسٹر فٹ اور دوسرے کئی پارلیمنٹ کے ممبروں سے فرقہ وارانہ سوال پر گفتگو کی۔ میری گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمان کوئی نئی چیز نہیں مانگتا لیکن یہ چاہتا ہے کہ ابتک قانون میں جو تحفظ رکھے گئے ہیں یا ملازمتوں میں جو تعداد اسے دی گئی ہے وہ آئندہ بھی قائم رہے۔

۱۱ دسمبر کو لطیفی صاحب آئی سی۔ ایس کے ساتھ انہیں کارلٹن میں لنچ کھا کر ہاؤس آف کامنس میں وزیر اعظم کے کمرے میں گیا۔ وہاں دیگر ممبران بھی جمع ہو گئے تھے۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت درج ہے۔ ڈاکٹر مونجے نے بیٹھتے ہی یہ کہا کہ ہم مسلمانوں کو نہرو رپورٹ سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔ سرتیج نے کہا کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کو کبھی منظور نہیں کیا اور اب جبکہ کانگرس نے خود اسے مسترد کر دیا تو اس کا کیا ذکر۔ پھر سر سیتل واد نے کہا کہ تیرہ پوائنٹ پر ہم میں اتفاق ہو گیا تھا۔ اول انھیں پیش کرو۔ ڈاکٹر مونجے نے اس سے اختلاف کیا کہ وہ تو سب کا لعدم ہیں۔ اول بحث جداگانہ اور مشترکہ انتخاب پر ہو۔ جناح نے کہا کہ ہم میں یہ طے ہو گیا تھا کہ جب تک آپ تیرہ پوائنٹس نہ مانیں انتخاب پر بحث نہ ہوگی۔ کیا وہ تسلیم ہیں۔ اس پر ڈاکٹر مونجے اور مسٹر جیکا

نے بہت گڑبڑ مچائی۔

یہ میٹنگ بھی بغیر نتیجہ ختم ہوئی۔ اب خیال آتا ہے کہ ان ذرا ذرا سی ضدوں نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ سنجاہ ۱۴ کے ۱۴ امور پر اتفاق ہو گیا تھا فقط جداگانہ انتخاب کا قضیہ باقی تھا جس کے متعلق مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ محمد علی کے فارمولے کو منظور کر لیا جائے۔ اس فارمولے کا منشا یہ تھا کہ ہر منتخبہ ممبر کو ایک خاص فی صدی رائے ہندو اور مسلمان دونوں کی لانی ضروری تھی یعنی کوئی ممبر فقط مسلمان یا ہندو رائیوں سے منتخب نہ ہو۔ اس تجویز میں کچھ خامیاں ضرور تھیں۔ لیکن جو حال کہ ہندوستان کا بن گیا اس کے مقابل یہ تجویز بھی غنیمت ہوتی۔

وزیر اعظم کے مکان جیکبہ میں میٹنگ

۱۳ دسمبر کو میں اور مولانا محمد علی مرحوم وزیر اعظم کی قیام گاہ جیکبہ پہنچے۔

راہ میں مجھ سے اور مولانا مرحوم سے گفتگو ہوتی رہی۔ وہ کانگریس سے دل برداشتہ تھے۔ اور اہل وطن کی تنگ نظری کے شاکی وہ سیکنڈ چیمبر یعنی ایوانِ اعلیٰ کے قیام کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایوانِ اعلیٰ کا قیام دولت مندوں کو طاقت پہنچائے گا اور جمہوریت کے خلاف ہے۔ جب ہم "جیکبہ" پہونچے تو اور لوگ آ چکے تھے اور میٹنگ شروع ہو گئی تھی۔ جناح مرحوم مسلمانوں کے نقطہ نظر پر تقریر کر رہے تھے

زیر بحث پنجاب تھا۔ سوال یہ تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت اتنی کم ہے کہ سکھوں کو مردم شماری سے زیادہ نشست کہاں سے دی جائے۔ میں نے یہ کہا کہ پنجاب کے بعض اضلاع جو یو۔پی سے ملحق ہیں۔ انھیں یو۔پی سے ملا دیا جائے۔ یہ اضلاع ایسے ہیں۔ جن میں ہندو اکثریت ہے یا سرحدی صوبہ کے اضلاع پنجاب میں ملا دئے جائیں۔ ان اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی اکثریت میں اضافہ کر کے سکھوں کو زیادہ نشست دی جائیں۔ اسے کسی نے پسند نہ کیا۔

وزیر اعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ پنجاب میں اسی فی صدی سیٹ کا انتخاب بذریعہ مخلوط انتخاب ہو لیکن ہر فرقہ کی تعداد نشست ریزرو (مخصوص) کر دی جائے اور بیس فی سیٹ بلا کسی نشست کو مخصوص کئے

ہوئے بذریعہ مخلوط انتخاب کے ہو۔ اس تجویز کو راجہ صاحب نریندر ناتھ آنجہانی نے نامنظور کیا تو آخر میں کچھ
گفتگو کے بعد سر میاں محمد شفیع مرحوم نے اُسے مسلمانوں کی طرف سے نامنظور کر دیا۔ اس وقت ڈاکٹر مونجے اور
مسٹر جیکر بولے کہ ہمیں منظور ہے۔ ان حضرات کا منظور کرنا محض مصلحتاً تھا۔ دراصل راجہ نریندر ناتھ اور سر
میاں محمد شفیع (جو دونوں پنجاب کے نمائندے تھے) کے انکار کے بعد یہ تجویز ختم ہو گئی تھی۔ پھر وزیر اعظم
نے مسلمانوں سے پوچھا کہ اگر سکھ اپنی مردم شماری سے زیادہ تعداد کا مطالبہ چھوڑ دیں تاکہ پنجاب کا یہ قصہ طے ہو جائے
تو کیا مسلمان اور صوبہ میں اس پر تیار ہوں گے اس پر سر سلطان احمد نے کہا کہ ایسی شکل میں مسلمان کسی
انتخاب میں حصہ نہ لیں گے۔ یہ کوشش بھی اس طرح ناکام رہا۔ ہندو مسلمان قضیہ کا فیصلہ نہ ہونا تھا نہ
ہوا۔ پہلی گول میز کانفرنس اس گتھی کو نہ سلجھا سکی۔ یہاں میری ایک تقریر کا اقتباس بے موقع نہ ہوگا۔

December 29th, 1930.

"It is with a feeling of humiliation that I rise to speak today The proud and honourable position for us would have been to have come before you, Mr. Prime Minister, with a settlement of the communal problem in hand. I entirely agree with my sister delegate that the time for general appeals of nationalism has gone by and we must now face the facts as they are and endeavour to tackle them as best as we can.

Minorities are insistent on safeguards—this cannot be denied. Their fears may be imaginary or real; but whatever they may be it is essential to create in their minds a feeling of security, if the new constitution is to succeed ....

To me it appears that these safeguards are not the cayse but the outcome of mistrust. Safeguards are not the creators but the creatures of misgivings. Otherwise I fail to understand why the Muslims first asked for these safeguards when the Minto-Morley

reforms were being introduced. Therefore in my opinion as long as these doubts and misgivings continue and are not replaced by mutual trust and confidence, we cannot as practical men deny safeguards to these who wish to have them. Trust and confidence cannot be created to order....they must come from within. They cannot be planted but must grow. ... ...

... ...

My suggestion, therefore, is that we have separate electorates for the present, while putting into the constitution a clause enabling any minority wishing to surrender this right to move a resolution to that effect in the House ... ...

I have strong hopes that after a few years' of successful working of the new constitution the minorities will realise that there is no need for separate electorate. After all, separate electorate are not a goal in itself, they are a means to achieve the goal. If we embody in the constitution or the rules framed under the constitution such other safeguards of religious and cultural protection and a fair share to all communities in the Government and services then surely the minorities will soon realise that the goal is achieved and that separate electorates are no longer necessary."

سر سلطان احمد صاحب سے مجھے اچھی طرح نیاز حاصل ہے اور حیدرآباد میں ۱۹۴۷ء میں مجھے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ موجودہ تعلیم کے ساتھ پرانے زمانہ کے اخلاق و آداب کے بہترین نمونہ ہیں۔ آپ نے صوبۂ بہار میں بڑی ترقی کی۔ جنگ کے زمانہ میں حکومتِ ہند میں کونسلر تھے۔ سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے۔ بیرسٹر ہیں۔ قانونی قابلیت بے مثل ہے۔ تدبر اور موقع شناسی بغایت موجود ہے۔

زندگی کے لذت و الم میں ہماری عادتوں کو بھی کیسا دخل ہوتا ہے۔ ایک دن لارڈ ریڈنگ نے اپنا بیٹھ ہوم

دیا۔ میں اور ہز ہائی نس بھوپال ایک ہی موٹر میں گئے۔ ہز ہائی نس نے مجھے ایک پان دیا۔ کیا کہوں کتنا لطف آیا۔ بات نے بھی مزا دیا اور پان نے بھی۔

اسی روز مہاراجہ بیکانیر نے کارلٹن ہوٹل میں ایک ڈنر دیا۔ ممتاز مرحومہ بیگم شاہنواز کی صاحبزادی پاس بیٹھی تھیں بڑی طباع اور باخبر خاتون تھیں۔ گفتگو میں بڑی شیرینی اور دلکشی تھی۔ ان کی بے وقت اور الم ناک موت نے ہمارے ملک کی ہونہار خواتین کی صف میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا جو آسانی سے پُر نہ ہوگا۔

چونکہ پہلی گول میز کانفرنس قریب ختم تھی۔ آجکل دعوتیں اس کثرت سے ہو رہی تھیں کہ قبول کرتے وقت یہ سوچنا پڑتا تھا کہ کس دعوت کو قبول کیا جائے اور کسے ترک۔

اٹھارہ دسمبر کو وزیر اعظم مسٹر رمزے میگڈانل کے ہاں لنچ پر گیا۔ دورانِ گفتگو میں وہ فرمانے لگے کہ دو تین روز میں دوسرے ویسرائے کا اعلان ہو جائے گا۔ ہم نے بہت اچھا شخص ہندوستان کو دیا ہے جسے ہندوستان کے معاملات سے واقفیت ہے۔

لارڈ ولنگڈن کا تقرر

کچھ دنوں بعد ہی لارڈ ولنگڈن کے تقرر کا اعلان بحیثیت ویسرائے ہندوستان ہوا۔ اسی زمانہ میں بعض حلقوں میں یہ خبر گرم تھی کہ شاید رمزے میگڈانل خود ویسرائے ہو کر جائیں مگر بالکل بے اصل ثابت ہوئی مجھے چند ماہ لارڈ ولنگڈن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ یوں بھی مجھ پر بہت عنایت کرتے تھے۔ یہ بہت خلیق اور بڑے دریا دل میزبان تھے میاں یہ کہئے کہ لیڈی ولنگڈن بڑی دریا دلی سے میزبانی کرتی تھیں۔

لارڈ ولنگڈن تفصیلات سے گھبراتے تھے۔ لیکن جو پالیسی وہ اختیار کر لیتے تھے اس پر پوری قوت اور قابلیت صرف کر دیتے تھے۔

رمضان قریب آ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ ہندوستان پہنچوں۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ماہِ صیام میں برابر روزے رکھتا ہوں بدنصیبی سے ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے اپنی محراب کی فکر تھی۔ ۱۹ دسمبر کو میں نے ہز ہائینس آغا خان سے مشورہ کیا۔ میں نے خواہش کی کہ مجھے واپس جانے دیں لیکن ہز ہائی نس کو اصرار تھا اور اس درجہ اصرار

تھا کہ میرے روزنامچہ میں ان کا یہ الفاظ روکنا تحریر ہے۔ میں تمھیں مثل اپنے بیٹے کے سمجھتا ہوں، میں تم سے کہتا ہوں کہ تم مت جاؤ۔" مجھے رُکنا ہی پڑا۔

ایک ڈنر

میں نے ۹ ار دسمبر کو اپنے ہوٹل میں چند با اثر ممبران لیبر پارٹی کی دعوت کی۔ اس دعوت میں سرمیاں محمد شفیع مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم کو بھی بلایا تھا۔ مجھے اس روز یہ اندازہ بڑے وثوق سے ہو گیا کہ بسا اوقات ایک طویل تقریر چاہے وہ کتنی ہی مدلل ہو سامعین کو مطمئن نہیں کرتی۔ لیکن باہمی گفتگو کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس جلسہ میں رائٹ آنریبل ایم۔ اے پیسن اور مسٹر ڈبلیو جو ویٹ بھی تھے۔ مگر یہ حضرات چونکہ حکومت کے اراکین میں سے تھے اس واسطے زیادہ تر خاموش رہے۔ البتہ میجر گریہم پول اور کمانڈر کین ورتھی بڑے اخلاص سے ہندوستان کے مطالبہ آزادی کے حامی تھے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنڈرسن (جو مسٹر ہنڈرسن وزیر خارجہ حکومت وقت کے صاحبزادے تھے) موجود تھے۔ اقلیتوں کے تحفظات کا سوال ان کی دشواری کا باعث تھا۔ یہ سوال فقط مسلمانوں کا سوال نہ تھا۔ بلکہ جملہ اقلیتوں کا تھا۔ جن صوبوں میں مسلمان کم ہیں۔ وہ تحفظات چاہتے تھے جہاں ہندو کم تھے وہ تحفظات چاہتے تھے سکھ اور پست اقوام کے نمائندے اپنے واسطے حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لہذا یہ سوال پورے ہندوستان کا سوال تھا۔ حکومت خود اختیاری میں سوائے اس کے کہ یہ تحفظات خود آئین کا ایک حصہ ہوں کوئی اور ایسا طریقہ نہ تھا کہ جو کسی حد تک قابل اعتماد ہو۔ انگریز کے واسطے ان چیزوں کا سمجھنا دشوار تھا۔ خاص کر مزدور پارٹی کے ممبران کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ خود مختار حکومت کے ساتھ تحفظات کیوں ہو۔ مسٹر ہنڈرسن (جو اب لارڈ ہو گئے ہیں) اور چند پارلیمنٹ کے ممبر کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہے۔ مجھ سے اسی موضوع پر سوالات کرتے رہے۔ اب تمام اور مہمان جا چکے تھے۔ بارہ ساڑھے بارہ تک گفتگو ہوتی رہی۔

میں نے کہا کہ سیاسی جماعتوں کی تفریق کسی سیاسی پروگرام یا عقائد پر ہوتی ہے۔ لہذا کبھی اکثریت

اقلیت بن جاتی ہے کبھی ایک انتخاب کی اقلیت دوسرے انتخاب میں اکثریت ہوجاتی ہے لیکن جہاں تقسیم مذہب کے اعتبار پر ہو تو صورت مختلف ہوجاتی ہے۔ جب تک کہ ملک میں ایسی سیاسی جماعتیں نہ پیدا ہوں جو سیاسی پروگرام کی بنا پر لوگوں کی حمایت حاصل کریں۔ جب تک ملک میں اتنا سیاسی شعور نہ ہو کہ لوگ بلا خیال مذہب وملت کسی سیاسی پروگرام کی حمایت کریں۔ اس وقت تک اقلیت کے حقوق کے تحفظ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شہر ٹورکی

میں ۲۷ دسمبر کو ٹورکی گیا۔ شام تک لیڈی شفیع اور ممتاز مرحوم بھی آگئیں۔ یہ شہر بہت خوبصورت ہے ہمارا ہوٹل سمندر کے کنارے ہے۔ دو روز یہاں بہت دلچسپ گزرے۔ "لیڈی شفیع" سر میاں محمد شفیع کی بیوی ہیں۔ بڑی خوبیوں کی خاتون ہیں۔ ماں کی طرح محبت اور شفقت کرتی ہیں۔ پرانے مذہب خیال کا بہترین نمونہ ہیں

بیگم شاہنواز۔ سر میاں محمد شفیع کی صاحبزادی ہیں۔ ہندوستان کی قابل ترین خواتین میں سے ایک ہیں۔ میرے ساتھ بڑا کرم فرماتی ہیں۔ تقریر بڑی سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ گول میز کانفرنس کی ممبر تھیں۔ لندن کی سوسائٹی میں بہت مقبول تھیں۔ میں نے ایسی معاملہ فہم زیرک اور موقع شناس خواتین کم دیکھی ہیں۔

ممتاز مرحومہ

کے متعلق میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ خدا نے مرحومہ کو بہترین صفات سے متصف کیا تھا۔ امریکہ جارہی تھیں ہوائی جہاز کے ایک حادثہ نے ایک جوشیلی مگر زیرک اور فہیم زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

اگر اُن کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کی خواتین کی صف میں یہ اولین خواتین میں سے ہوتیں۔ یہ بڑی اچھی شاعرہ تھیں۔ انگریزی میں شعر کہتی تھیں جو لندن کی سوسائٹی میں کافی مقبول تھے۔

مولانا محمد علی کی وفات

"خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں"

۴ر جنوری کو صبح ساڑھے نو بجے مولانا محمد علی کا انتقال ہوگیا۔ شب گزشتہ آدھی رات گئے تک ہندو مسلم سوال پر اپنی رائے لکھواتے رہے جو وزیراعظم کو دی گئی۔
ہم سب لوگ ہوٹل میں حاضر ہوئے۔ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ مولانا کا جنازہ بیت المقدس دفن کے واسطے لے گئے۔ اس غربت کی موت کا اثر ہر ہندوستانی پر بہت گہرا تھا۔ سچ ہے یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین پر اُسے موت آئے گی۔ مولانا کی موت نے ہندوستان کے سیاسی قائدین میں ایک ایسی جگہ خالی کردی کہ جواب پُر ہونا مشکل ہے۔ کون جانتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو ہندوستان کی تاریخ کس طرح لکھی گئی ہوتی۔
مجھے یقین ہے کہ مولانا مرحوم ہندوستان کی تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوتے اس لئے کہ ہندوستان کی تقسیم تو ان کی عمر بھر کی پالیسی کے خلاف تھی۔ ہز ہائی نس آغا خاں کا باوجود موجود ہونے کے جناح کا مشورہ کے لئے نہ بلانا اور مولانا محمد علی کا انتقال یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ جس سے ہندوستان کی تقسیم کے خلاف کوئی محاذ نہ بن سکا۔

ولایت سے واپسی

گول میز کانفرنس کے اختتام سے کچھ قبل میں واپس ہوا۔ وزیر اعظم نے ۱۹ جنوری کو ایک تقر
کی جس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ہندوستان کو ڈومنین اسٹیٹس مل جائے گا۔

پیرس ہوتا ہوا اٹلی پہنچا۔ خان صاحب لیاقت علی خاں میرے ساتھ تھے اور میرے آرام و آسائش کا بڑا
تنا ہی سے اہتمام کرتے تھے۔

موسم سرما میں یورپ خاصکر سوئٹزرلینڈ کا سفر اپنی خاص دل چسپیاں رکھتا ہے۔ ہندوستانی کے لئے
نظارہ کہ منتہائے نظر تک سوائے برف کے کچھ نظر نہ آئے کتنا عجیب اور دل چسپ ہوگا۔ ہماری ریل برف میں
گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ شب کی دھندلی روشنی میں شجر حجر سب برف کے تودے معلوم ہوتے تھے۔

ان ممالک میں سردی ہندوستان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی ہندوستان کی سردی جتنی
جسم میں نفوذ کرتی معلوم ہوتی ہے اس کا احساس مجھے یورپ میں نہیں ہوا۔ اول تو وہاں مکانات موسم سرما کے
لحاظ سے بنائے گئے ہیں، پھر انھیں گرم رکھنے کا بڑا اہتمام ہے۔ ایک شخص بے تکلف کمرے میں کرتہ پہنے بیٹھ سکتا
گو باہر برف باری ہو رہی ہو۔ دوسرے وہاں کی سردی مرطوب ہونے کی وجہ سے جسم میں اتنی چبھتی نہیں جتنی یہاں
خشک سردی

واپسی میں ہم ایک شب وینس میں ٹھیرے اور دوسرے روز با دل ناخواستہ عجیب شہر کو اور اسی کے
سرزمین یورپ کو الوداع کیا۔ گھر پہونچنے کی خوشی کے باوجود یہ خیال کہ کبھی پھر یہاں آنا ہوگا یا نہیں دل کو مغموم کر
شام کے قریب جہاز نے ساحل اٹلی کو چھوڑا۔ جب تک ہم ایڈریاٹک سمندر میں رہے سکون رہا لیکن
دوسری صبح کو جونہی جہاز بحر روم میں داخل ہوا سمندر میں طغیانی کیفیت رہی۔ مجھے طوفان موج افزا سے یہ پہلا
ہی سابقہ تھا۔ لہریں جہاز سے ٹکراتیں تو جہاز کا بند بند بول اٹھتا تھا۔ گہری نیلی موجیں جہاز کی طرف اس طرح بڑھ
تھیں جیسے اپنے آغوش میں لے کر تہہ میں مدفون کر دیں گی۔ پانی کی چھالیں جہاز کی ڈیک پر آنے لگیں۔ تیز ہوا اور
کے ڈیک پر آنے کی وجہ سے مسافروں کو ڈیک پر آنے کی اجازت نہ تھی۔ ہوتی بھی تو کون آسکتا تھا۔ نوے فی صدی مسا

تو اپنے کمروں ہی میں پڑے تھے اور جنھیں چکر نہیں آئے وہ بھی موجوں کے اندیشہ سے ڈیک پر نہ جا سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی اس طرح لوگ سمندر کی نذر ہو گئے ہیں۔ لیاقت علی خاں کو چکر آتے ہیں لیکن کم مجھے بالکل نہیں آتے۔ لیکن بعض لوگوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس درجہ جسمانی تصفیہ اور تخلیہ ہوتا ہے کہ مدقوق کے مریض کا سا حال ہو جاتا ہے۔ پورٹ سعید کے قریب طوفان میں کمی آئی۔ لوگ آرام کرسیوں پر آکر لیٹے اور نارنگی اور دوسری ترش چیزوں کے عرق کا دور شروع ہوا۔

بحیرِ احمر باوجود موسم سرما کے گرم تھا۔ جنوری کی آخری تاریخوں میں بمبئی آ گئے بہت سے دوست اور اقربا ساحل پر موجود تھے۔ ان سے مل کر جس قدر تفریح و مسرت ہوئی محتاجِ بیان نہیں۔

یورپ کی سوسائٹی

یورپین ممالک میں سوسائٹی اتنی منظم ہو گئی ہے کہ انسانی زندگی کے ہر ضرورت کی کامل رعایت موجود ہے وہاں صرف کسی فن یا کسی کام سے واقفیت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مخصوص قابلیت Expert knowledge. حاصل کرتے ہیں۔ اچھے سے اچھے اور بُرے سے بُرے کام کے Expert ایکسپرٹ وہاں موجود ہیں۔ مثلاً وہاں کا خدمت گار ہمارے یہاں کے خدمت گار سے۔ وہاں کے سکرٹری ہمارے یہاں کے سکرٹری سے۔ وہاں کا موٹر ڈرائیور ہمارے یہاں کے ڈرائیور سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ اسے اپنے کام پر فخر ہوتا ہے۔ وہ اپنے پیشے یا فن میں مہارت کامل حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مجھے یہ خود تجربہ ہوا کہ میرے ڈرائیور کو لندن اور مضافاتِ شہر کے نقشہ پر اتنا عبور تھا کہ چلنے سے پیشتر منزل پہلے پتہ بتا دیجیے وہ فوراً اپنا نقشہ دیکھے گا اور اس طرح آپ کو لے جائے گا کہ گویا وہ اکثر اس مقام پر آتا جاتا رہا ہے ہوٹلوں کی یہ حالت ہے کہ آپ ۲۴ گھنٹہ کا نوٹس دے کر دنیا کے بڑے سے بڑے شخص کی دعوت کر دیجیے آپ کو یا آپ کے مہمان کو شکوہ کا موقع نہ ہوگا۔

کاروباری اخلاق بہت اچھا ہے۔ وہاں کا ڈاکٹر۔ وکیل۔ انجنیر۔ دوکاندار غرض ہر پیشہ کا آدمی اس کی کوشش کرتا ہے کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دے۔

غرض وہاں سوسائٹی بہت ہی منظم ہے اور خواہ مزدور ہو یا سرمایہ دار کسان ہو یا زمیندار اپنے فرائض کو سمجھتے ہیں۔ فقط اپنے حقوق کو ہی نہیں دہراتے رہتے۔ انھیں اپنے حقوق کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے۔ یہ تو روشن پہلو ہے لیکن بتایا جاتا ہے کہ وہاں کے جرائم پیشہ بھی اپنے فن کے ایسے ماہر ہیں جس کی مثال ہمارے ملک میں نہیں ملتی۔ لنگار و نشاط کی کمی نہیں۔

علی گڑھ واپس آگیا۔ راحت فرحت سے ملا۔ شب کو جب پلنگ پر سونے کو لیٹا تو راحت نے بڑی محبت سے کہا کہ آپ کو سفر میں بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ اب گھر پر آرام ملے گا۔ میں نے کہا ہاں بیٹے گھر گھر ہی ہوتا ہے۔ تاہم وہاں ہر شعبۂ زندگی اتنا منظم ہو گیا ہے کہ اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔

چھتاری پہونچا۔ بچے اور رفیقۂ حیات موجود تھیں۔ سب نے بڑی مسرت و خلوص سے خیر مقدم کیا۔ باشندگان اور ملازمین نے بڑی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ ان کے لئے تحفے لایا تھا تقسیم کئے۔ خوش ہوا۔ اللہ کا شکر بجالایا۔ اور ایک دفعہ پھر خانگی زندگی کی مسرتوں میں کھو گیا۔

مجھے ہندوستان آکر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ راجہ کشل پال سنگھ صاحب کو ہائی کورٹ کے کسی فیصلہ کے ریمارک کی بناء پر استعفا دینا پڑا۔ چھتاری پہونچنے کے دوسرے دن یا تیسرے روز لیک لیڈی سری واستو چھتاری تشریف لائیں۔ مفصل حالات معلوم ہوئے۔ مجھے اُن کے آنے سے مسرت ہوئی۔ میرے اُن کے دوستانہ تعلقات پہلے سے تھے۔ اور آئندہ بہت ہی خاص تعلقات سر جے۔ پی اور اُن سے ہو گئے۔ لیکن اتنا افسوس بھی ہے کہ ان کا چھتاری آنا پہلی اور شاید آخری بار تھا۔ ممکن ہے کبھی پھر آئیں۔ بہر حال یو۔ پی میں کشل پال سنگھ صاحب کے بجائے سر جوالا پرشاد سری واستو وزیر ہو گئے۔

سر جے۔ پی اور لیڈی سری واستو

سر جوالا پرشاد سری واستو بڑے ذہین اور دور بین شخص ہیں۔ علمی قابلیت بہت اچھی۔ لکنت کی وجہ سے تقریر چنداں اثر آفریں نہیں ہوتی لیکن تحریر بہت مدلل اور عبارت آرائی سے پاک ہوتی ہے۔
یہ سلف میڈ (خود ساختہ) آدمی ہیں۔ شاید ۱۹۲۶ء تک محکمہ صنعت و حرفت میں ملازم تھے۔

پھر مسٹر ایلن کی مل میں کام کرنے لگے اور آج اس کارخانہ کے مالک ہیں۔ کانپور کے کاروباری حضرات
میں اب چوٹی کے لوگوں میں ان کا شمار ہے۔ ایک کامیاب کاروباری شخص میں جتنی صفات ہونی چاہئیں
وہ ان میں موجود ہیں۔ کانپور کے یورپین تاجروں کو ان پر بہت بھروسہ تھا اور انھیں کی وجہ سے یہ
انتخاب میں اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ خفا ہو جائیں تو آسانی سے معاف نہیں کرتے۔ ان کی دوستی بہت
ٹھوک بجا کر ہوتی ہے اور مفید و کارآمد لوگ اس دائرہ میں آتے ہیں۔ میزبانی فیاضی سے کرتے ہیں۔ خود
میری اور دوسرے مقتدر لوگوں کی دعوتیں اتنی شان سے کرتے تھے کہ اس میں کسی مزید اضافہ کی ضرورت باقی
نہیں رہتی۔ سیاسی مصالح کی وجہ سے ہندو مہاسبھا کے بڑے حامی ہیں لیکن در اصل مذہبی تعصب ان میں
نہیں ہے۔ ہاں مصلحتِ وقت اور اقتضائے موقع سے مجبوری الگ بات ہے۔

لیڈی سریواستو۔ بڑی ہوشمند خاتون ہیں۔ سوسائٹی میں بڑی مقبول مہمان نوازی میں بڑی فیاض
ہیں۔ سوجھ بوجھ بہت ہے۔ سر جے۔ پی کی کامیابی میں ان کی ذہانت اور موقع شناسی کو بڑا دخل ہے
اسمبلی کی ممبر تھیں تو اکثر خود سر جے۔ پی کے خلاف تقریر کرتیں۔ سر جے۔ پی سیاست برطانیہ کی موافقت
میں تھے۔ لیڈی سریواستو آزاد خیال لوگوں کی بھی ہمنوائی کرتیں۔ جو لوگ کہ سر جے۔ پی کے سیاسی میدان
میں مخالف تھے انھیں بھی اپنی تواضع و مدارات کی وجہ سے ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ میں ان کی قابلیت
موقع شناسی۔ تدبر اور دور اندیشی کا ہمیشہ معترف اور مداح رہا۔

میں نے آکر نواب سر عزیز اللہ خاں سے ہوم ممبری کا چارج لے لیا۔ اور وہی سرکاری روزمرہ
کے مشاغل شروع ہو گئے۔

اقتصادی حالات میں تبدیلی تو ایک سال قبل سے ہی رونما ہو چکی تھی لیکن سنہ ۲۹ء و سنہ ۳۰ء
میں اس تبدیلی کا اثر عام طور پر محسوس ہونے لگا۔ جنگ کے زمانے میں جو عارضی مرفہ الحالی پیدا ہوئی
تھی۔ وہ اب ختم ہو رہی تھی۔ اس کے اثرات سے تمام دنیا متاثر ہو رہی تھی۔ امریکہ اور انگلستان
میں بھی بے روزگار لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان کا چونکہ یہ پرانا دستور رہا ہے کہ اگر
ایک شخص برسر روزگار ہو تو خاندان کے لوگوں کو سہارا دیتا ہے اسی وجہ سے بے روزگاری کا احساس اتنا

زیادہ نہ تھا۔ لیکن اناج کی قیمت مزدور کی اُجرت بڑی تیزی سے گر رہی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کاشتکار سے لگان وصول ہونا دشوار ہو گیا۔ سر جارج لیمبرٹ عارضی طور پر گورنری کر رہے تھے اور مسٹر جے۔ بی اسمتھ عارضی فنانس ممبر تھے۔ یہ دونوں حضرات اس مسئلہ کی اہمیت کا پورا اندازہ نہ کر سکے۔ یہ دونوں اس پر تو تیار تھے کہ کاشتکار کے ساتھ لگان میں کچھ رعایت کر دی جائے لیکن زمیندار کے ساتھ مالگزاری میں رعایت کرنے میں پس و پیش کرتے تھے

سر جارج لیمبرٹ اسمتھ

سر جارج لیمبرٹ میرے بڑے مخلص دوست تھے اور بحیثیت چیف سکریٹری بہت کامیاب رہے۔ ان کی انتظامی قابلیت بہت اچھی تھی۔ خاموش مگر بہت مضبوط شخص تھے۔ لیکن سیاسی دور اندیشی ان میں نہ تھی جو چیز اُن کے سامنے ہو۔ اس کا علاج سوچتے تھے۔ مگر کسی خاص فعل یا ترکِ فعل سے کیا کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں اس کا تصور اور پیش بندی کرنے کی قابلیت ان میں نہ تھی۔

مسٹر اسمتھ۔ اوسط درجہ کے آئی سی۔ ایس تھے جو فقط سینیر ہونے کی وجہ سے فنانس ممبر تھے۔ وہ ان حالات کی نزاکت کا اندازہ بالکل نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سول نافرمانی کی شورش کو فروغ دینے کا ایک سنہری موقع کانگریس پارٹی کو مل گیا۔ دیہات میں بھی ہیجان پیدا ہو گیا۔ جس سے کانگریس نے بجا طور پر فائدہ اٹھایا

انقلابی حالت پیدا کرنے میں دو چیزیں بڑی مدد دیتی ہیں۔ اول ملک میں بدامنی۔ دوم ملک کے لوگوں کی مالی اور اقتصادی حالت کا خراب ہونا۔ یہ دونوں حالات خود بھی ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ اگر ان میں ایک صورت رونما ہو جائے اور بروقت مداوا نہ کیا جائے تو دوسری شکل کے پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں تمام ملک میں جرائم کی زیادتی۔ فرقہ وارانہ تصادم۔ زمیندار اور کاشتکار کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔

کان پور کا بلوہ

یوں تو بنارس اور دوسرے مقامات پر فرقہ وارانہ جھگڑے ہوئے لیکن ۲۴ مارچ ۱۹۳۱ء کو کان پور میں بڑا سخت بلوہ ہوا۔

بجٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ سر جگدیش پرشاد چیف سکریٹری تھے۔ وہ اور میں بے حد پریشان تھے۔ تین چار دن تک یہ بلوہ نہ رک سکا۔ سرکاری علم کے مطابق تین چار سو کے درمیان مقتولین کی تعداد ہو گئی ہیں اپنے ساڑھے سات برس ہوم ممبری کے زمانے میں اس بلوہ کو سب سے زیادہ اندوہناک واقعہ خیال کرتا ہوں جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

سر جگدیش پرشاد نے میرے منشا سے الہ آباد سر مہاراج سنگھ کو فون کیا کہ فوراً کانپور پہنچیں صوبہ کے مختلف اضلاع سے مزید پولیس اور فوج کے پہنچنے کا انتظام کیا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ خود کانپور جاکر مقامی حکام کو مدد دوں۔ غیر سرکاری ذریعہ سے مجھے مسٹر سیل ڈپٹی کمشنر کانپور کی شکایت پہونچی تھی کہ وہ ضرورت وقت کے لحاظ سے سست تھے میں نے سر جارج لیمبرٹ سے ذکر کیا اور یہ خواہش کی کہ چیف سکریٹری کو اپنے ہمراہ لے کر کانپور جاؤں۔ سر جارج کا خیال تھا کہ ہمیں مقامی حکام کے معاملہ میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ میں اسے مانتا ہوں کہ اکثر موقعوں پر یہ نظریہ درست ہوتا ہے لیکن اس موقع پر درست نہ تھا۔

میری اس گفتگو کے دوسرے یا تیسرے دن کانپور کے یوروپین تاجر حضرات نے سر جارج پر زور دیا کہ انھیں خود کانپور جانا چاہیئے۔ سر جارج اور میں کانپور پہنچے۔ وہاں بہت سے واقعہ دیکھے۔ حالت سدھر چکی تھی مگر کہیں کہیں سے نعشیں برآمد ہو رہی تھیں۔

مجھے اس معائنہ موقع اور مختلف حضرات کی گفتگو سے یقین ہو گیا تھا کہ مقامی حکام الزام سے بری نہیں ہو سکتے اگر وہ سست نہ ہوتے تو تین چار روز تک بلوہ جاری نہ رہتا۔

میں نے لکھنؤ آتے ہی اپنے اس خیال کا اظہار سر جارج پر کر دیا مگر انھیں مجھ سے اتفاق نہ تھا۔ وہ انھیں بے قصور خیال کرتے تھے۔

چنانچہ کانپور کی واپسی پر ۱۳ مارچ کو سر جارج نے اسمبلی کو خطاب کیا اور مسٹر سیل اور دوسرے مقامی حکام کی تعریف کی۔ یہ ایک ایسی غلطی سر جارج سے ہوئی جس کا نتیجہ انھیں آئندہ اٹھانا پڑا۔

اس تقریر کا فوری اثر یہ ہوا کہ سختی سے پبلک سے یہ مطالبہ ہوا کہ تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے سر ہائیکل کین

کی زیرِ صدارت کمیشن بیٹھا جس کے ایک ممبر نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی تھے۔ اس کمیشن کی رپورٹ مسٹر سیل کے خلاف تھی اور انھیں فوراً چھٹی پر جانا پڑا۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ حکومت مقامی حکام کے وقار کا خیال نہ رکھے تو انتظام میں بڑی ابتری پڑتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب وہ غلطیاں کریں تب بھی ان کو سراہا جائے۔ ایسے اہم واقعہ کے بعد تحقیقاتی کمیشن کا بیٹھنا لازمی تھا اس لئے گورنر کی طرف سے فوراً اظہارِ خیال نامناسب تھا کمیشن نے تحقیقات کے بعد مقامی حکام ان کو موردِ الزام ٹھہرایا

اگر ملک میں امن قائم رکھنا انتظامی در و بست کو برقرار رکھنا اور قانون و انصاف کی بالادستی منظور ہے تو منجملہ دوسرے اور امور کے اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ملازمین سرکار کو سیاسی جماعتوں کے لیڈر مرعوب نہ کر سکیں جمہوریت کی خوبیاں تو اس درجہ دنیا کے سامنے آ چکی ہیں لکھی جاتی ہیں۔ بیان کی جاتی ہیں کہ ان کا دہرانا تحصیل حاصل ہے لیکن جمہوریت کے اس اندیشہ کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بسا اوقات مقامی لیڈر ملازمین کے کام میں خلل ڈال کر کے انصاف کا خون کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان حالات میں ملازم کی حفاظت ضروری ہے مگر جب ملازم کا قصور ثابت ہو گیا اور اس کے نتائج سامنے آ گئے تو پھر ملازم کو سزا ملنا لازمی ہے ورنہ رعایا کو حکومت پر اعتماد نہیں رہتا

یوں تو کان پور کی خونیں داستان بجائے خود بڑی دردناک تھی مگر میرے ایک دوست گنیشی شنکر ودیارتی ایم۔ ایل۔ اے کی موت اس وجہ سے خاصکر قابلِ افسوس ہے کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کے خیر طلب تھے اور فرقہ وارانہ تعصب سے انھیں دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ ایسے نیک انسان کا خود اس حیوانیت کا شکار ہو جانا بڑا ہی الم ناک حادثہ تھا۔

اس زمانے کی انتظامی فضا تمام ہندوستان میں مکدر ہو گئی تھی۔ اقتصادی مشکلات نے ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ یو۔ پی اس سے مستثنیٰ نہ تھا بلکہ اقتصادی اثرات اس صوبے میں کاشتکار اور زمیندار کے تعلقات پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

صلح کی کوشش

ادھر وزیرِ اعظم برطانیہ نے اس بات کا اعلان کیا کہ ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس یعنی حکومتِ برطانیہ کا

مقصد ہے۔ ادھر رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو۔ رائٹ آنریبل سری نواس شاستری اور مسٹر جیکر نے پنڈت موتی لال نہرو کو تار دیا اور حکومت ہند اور کانگریس کے درمیان صلح کی گفتگو کی بنیاد پڑی۔

لارڈ اروِن نے کانگریس کی عاملہ جماعت سے پابندی ہٹائی جس کی وجہ سے اس جماعت کو خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا تھا۔ وہ بسرائے چاہتے تھے کہ وزیر اعظم کے اعلان پر کانگریس غور کر سکے اور گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر ہندوستان کے آئین بنانے میں حصہ لے۔

پنڈت موتی لال نہرو کی رحلت

۶ر فروری کو پنڈت جی کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ اس حادثہ سے ہندوستان ایک سچے فدائی کی بیش بہا خدمات سے محروم ہو گیا۔ خاص کر جب کہ ملک کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ یوں تو دنیا کی محفل ہمیشہ ایسی رہی ہے کہ لاکھوں کے اٹھ جانے پر بھی اس کی رونق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن پنڈت جی کے انتقال نے جس جگہ کو خالی کر دیا وہ پُر نہ ہو سکی۔ یہ سچ ہے کہ عوام پر مہاتما جی کے روحانی یا مذہبی اثر کی مثال ہندوستان تو کیا دنیا کے کسی حصہ میں بھی نہیں ملتی۔ لیکن پنڈت جی کی ذہنی اور دماغی قابلیت وضعداری اخلاق۔ مروت۔ بذلہ سنجی محفل آرائی اب کہاں۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

مجھ پر اس حادثہ کا بڑا اثر پڑا تھا۔ میں نے اس کا اظہار اسمبلی میں کیا تھا۔ وہ تقریر محفوظ ہے۔

"..........................Pandit Moti Lal Nehru was one of the foremost leaders of this country. He had many noble qualities of head and heart, but his sole passion was his love for his motherland. He gave his all for the service of his country and the way he suffered and cheerfully bore many losses was simply wonderful. His death is a great national loss. To me, it is a personal loss also, because I hap-

ened to have had the privilege of knowing him as a friend,.... he was ery kind to me and I always looked upon him as the most sincere iend............ ...... God knows India can ill afford to lose a man like andit Moti Lal Nehru at the present moment."

سر تیج بہادر اور ان کے رفقاء کی کوشش سے ویسرائے (لارڈ ارون) اور مہاتما جی میں گفتگو شروع ہوئی۔ یہ فروری کا مہینہ تھا۔ مجھے اس کا احساس تھا کہ مقامی انگریز افسران اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن لارڈ ارون نے اس موقع پر بڑے استقلال سے کام لیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر انھوں نے اپنے ذاتی اثر سے کام نہ لیا ہوتا تو حکومت برطانیہ ان کی اس پالیسی پر آسانی سے رضی نہ ہوتی۔

اسی گفتگو کے دوران میں مجھے لارڈ ارون سے ملنے دہلی جانا پڑا۔ میں مہاتما جی سے بھی ملنے گیا وہ دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان میں تشریف رکھتے تھے۔ جہاں تک مجھے خیال پڑتا ہے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ مہاتما جی کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مہاتما جی جہاں ہوتے میلا لگ جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی خاص بات چیت نہ ہو سکی لیکن میرا دل بہت متاثر ہوا۔ مجھے ان کی بچوں جیسی بھولی مسکراہٹ بہت دل کش معلوم ہوئی۔ ان کا طرز بیان کچھ اس درجہ معصوم اور سادہ تھا کہ سامع مسحور ہو جاتا تھا۔

ویسرائے اور مہاتما جی کے درمیان آخر کار ایک متفقہ من سمجھوتہ ہو گیا۔ اور مہاتما جی اس پر راضی ہو گئے کہ وہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی طرف سے شریک ہو جائیں۔ لارڈ ارون کا خلوص کامیاب ہوا۔ کم از کم وہ کشیدگی اور تلخ کامی جاتی رہی جو اب تک ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس صلح کا اثر سرکاری حلقوں میں یہ تھا کہ لارڈ ارون کے اس فعل سے حکومت کے اقتدار کو نقصان پہنچا۔ انگریز افسران تقریباً سب اسی رائے کے قائل تھے۔

اسی فروری کے واقعہ کو میں نے کہیں پہلے بھی لارڈ ارون کی شرافت مزاج کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ مہاتما جی سے من سمجھوتہ کے متعلق مجھ سے دریافت کیا تو میں نے کہا کہ اس مصلحت کی وجہ سے اپنے انگلستان

کو دنیا کی نظر میں بہت بلند کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ اس تحریک کو دبانا ممکن تھا۔ لیکن میں اس کا قائل نہیں کہ ویرانہ کا نام امن و سکون رکھا جائے۔

۱۸ راپریل کو لارڈ اروِن کا زمانہ ختم ہوگیا اور لارڈ ولنگڈن ویسرائے ہوگئے۔

یہ ایک ایسے وائسرائے کا زمانہ ختم ہوا جو شرافت طبع کے لحاظ سے انگلستان کے شرفار کا بہترین نمونہ تھے کنسرویٹو پارٹی اور خاصکر مسٹر بالڈون پر ان کا بہت اثر تھا۔

ایک مختصر لنچ پارٹی پر میں نے مسٹر بالڈون کو بلایا تھا۔ دوران گفتگو میں لارڈ اروِن کا ذکر آیا۔ مسٹر بالڈون کے الفاظ کا منشا یہ تھا کہ انھوں نے لارڈ اروِن کی ذات میں ہندوستان کو انگلستان کا بہترین شخص دیا تھا۔

نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم

بڑے ذہین اور صاحب تدبر شخص تھے۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود انگریزی میں اظہار خیال کر لیتے تھے۔ اردو کی تقریر بہت خوب ہوتی تھی۔ گھر کا انتظام بڑی محنت سے کرتے تھے۔ مالی اعتبار سے بڑی ترقی کی۔ بڑے مصلحت بین اور زمانہ شناس تھے۔ حکومت کے بڑے سچے وفادار، جب تک انگریزی حکومت رہی اس کے وفادار رہے اور جب پہلی بار کانگریس حکومت ۱۹۳۷ء میں آئی تو اس کے ساتھ پورا تعاون کیا۔

سرسید کے رفقار میں سے ایک یہ بھی تھے۔ یونیورسٹی کی خدمت بڑی فیاضی سے انجام دیتے تھے۔ مجھ پر کرم فرماتے تھے اور مجھے یہ اختیار دیا تھا کہ جتنا چندہ جہاں میں دوں اتنا ہی اُن کی طرف سے اعلان کر سکتا ہوں۔

مہاراجہ محمود آباد کی رحلت

اسی سال مئی کے زمانے میں جب میں نینی تال تھا مہاراجہ کے انتقال کی خبر آئی۔ چونکہ مرحوم کی

علالت کی اطلاع مجھے پہلے سے نہ تھی۔ مجھے اس خبر سے بڑا دھکا سا لگا۔ مہاراجہ کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہ خیال وگمان بھی نہ ہوتا تھا۔ اتنی جلد وہ داعی اجل کو لبیک کہیں گے۔ مجھے اس خبر سے بہت افسوس ہوا۔ مہاراجہ بڑے شخصیت کے حامل تھے۔ جو ارادہ کر لیتے اُسے کر ہی کے مانتے۔ بڑے شاہ خرچ اور فیاض تھے۔ سیاسی تحریکات میں بہت حصہ لیتے تھے اور بہت خرچ کرتے تھے۔ اگر تعلقداری کی مجبوریاں نہ ہوتیں تو وہ یقینی ہندوستان کے قائدین کی صف اول میں ہوتے۔ ہندوستان کی آزادی کے بڑے حامی تھے۔ مسٹر جناح مرحوم ومغفور کے ساتھ ان کے بہت خاص تعلقات تھے۔ اس زمانے کی کوئی قومی تحریک ایسی نہ تھی جس میں ان کی مدد شامل نہ ہو۔ مجھے ذاتی اور خاندانی وابستگی مرحوم کے ساتھ تھی۔ میرے چچا نواب یوسف علی خاں مرحوم سے اُن کے بہت مخلصانہ تعلقات تھے۔ میں ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ اس چھ ماہ میں ہندوستان کے تین ایسے اشخاص اُٹھ گئے۔ جن کی ہندوستان کو سخت ضرورت تھی۔ مولانا محمد علی۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مہاراجہ محمود آباد، رہے نام اللہ کا۔

کونسل کا اجلاس

سنہ ۳۰ء کے انتخاب کے بعد یہ نئی کونسل آئی تھی۔ سوراجسٹ پارٹی انتخاب میں شریک نہیں ہوئی۔ سی۔ وائی چنتامنی کے ساتھی آئے۔ باقی زمینداروں کی اکثریت تھی۔

سیاسی طور پر کونسل کے رنگ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں شخصی ردوبدل ضرور جہاں تہاں ہو گیا تھا۔

کونسل کا ایک مختصر اجلاس تو میری غیر موجودگی میں ہو چکا تھا۔ جس میں چھتر رائے بہادر سر سیتا رام اسپیکر مقرر ہو گئے تھے۔

دوسرا اجلاس فروری میں شروع ہوا۔ اس میں سب سے زیادہ جھگڑے کا مسئلہ ڈپٹی اسپیکر کے انتخاب کا تھا۔

دو نام انتخاب کے لئے پیش ہوئے۔ (۱) نواب زادہ لیاقت علی خاں (۲) کنور سرندر پرتاپ ساہی
نواب زادہ صاحب کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کنور سرندر پرتاپ ساہی میری پارٹی
کے ممبر تھے۔ سلطان پور کے رہنے والے اور بڑے جوڑ توڑ کے آدمی تھے۔

اگر میں ولایت نہ گیا ہوتا تو اس کا ضرور امکان تھا کہ یہ جھگڑا پیدا نہ ہوتا۔ لیکن میری پارٹی کے
بہت سے لوگوں سے وعدے سرندر پرتاپ ساہی نے پہلے ہی لے لئے تھے۔ نواب زادہ صاحب گو
پارٹی میں نہ تھے۔ مگر مجھے مدد دیتے تھے اور کبھی میری مخالفت نہیں کی۔ پھر اہلیت اور قابلیت کے لحاظ
سے نواب زادہ لیاقت علی خاں سے کنور سرندر پرتاپ کو دور کی بھی نسبت نہ تھی۔ انگریز ممبران اور اکثر
دوسرے ممبر نواب زادہ صاحب کو چاہتے تھے۔ چنتامنی کی پارٹی کے لوگوں میں کچھ ادھر تھے اور کچھ اُدھر
غالباً اُن کا منشا فقط یہ تھا کہ میری پارٹی میں تفرقہ پڑ جائے۔

میں دل سے نواب زادہ کو ترجیح دیتا تھا۔ لیکن پارٹی کے لوگ اس پر اصرار کرتے تھے کہ ہماری
پارٹی کا ڈپٹی اسپیکر ہو۔ زمیندار پارٹی کے لوگ اکثر اپنے روپیے اور اپنے اثر کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے
ان میں ڈسپلن رکھنا آسان نہ تھا۔ بہرحال یہ انتخاب ایک خلجان بن گیا۔ میں نے یہ طے کیا کہ اسے پارٹی کا
سوال نہ بنایا جائے جو جس سے وعدہ کر چکا ہو اُسے رائے دے۔ آخر کار نواب زادہ کو ۵۳ رائے
ملیں اور کنور سرندر پرتاپ ساہی کو ۴۹۔

مارچ کے مہینہ میں بجٹ کا اجلاس شروع ہوا۔ جنرل مباحثہ کی تقاریر میں مسٹر چنتامنی (لیڈر
اپوزیشن) نے اپنی تقریر میں "گاندھی ارون" سمجھوتہ کو سراہا۔

میں نے اپنی تقریر میں اسپیکر کو ان کے دوبارہ انتخاب پر اور "سر" کے خطاب پانے پر مبارکباد
دے کر حسب ذیل الفاظ میں اس سمجھوتہ کی طرف اشارہ کیا۔

میں لیڈر آف اپوزیشن کے ساتھ اپنے کو ہمنوا پاتا ہوں۔ اس اظہار اطمینان پر جو ہم سب نے
ہز ایکسی لینسی وائسرائے کے اس سمجھوتہ پر محسوس کیا۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان جتنا ان کا ممنون ہے
اس کا الفاظ میں اظہار مشکل ہے۔ جانے سے پہلے اُن کے اس آخری فعل نے کشیدگی کے زمانے کو

ختم کر دیا۔ اقتصادی پیچیدگیاں جو ملک میں دشواریاں پیدا کر رہی تھیں۔ رک گئیں اور اب وہ سلسلہ بھی کہ جو ملک کے بہت سے نوجوانوں کو قید خانہ بھیج رہا تھا ختم ہو گیا۔ آخرکار یہ نوجوان ہمارے ہی گوشت پوست ہیں۔ ہمارے ہی اعزار و اقربا ہیں۔ یہ باعث مسرت و اطمینان ہے کہ ہیجان اور تکالیف کا زمانہ ختم ہو گیا۔

چونکہ یہ بجٹ کا اجلاس تھا۔ حسب قاعدہ بجٹ پیش ہوتے رہے۔ جب محکمہ مال گزاری پر بحث ہوئی تو غیر سرکاری ممبروں نے اس پر زور دیا۔ جس میں زمیندار ممبر پیش پیش تھے کہ زمیندار کی مالگزاری اور کاشتکار کے لگان میں رعایت کرنی چاہیئے۔ حساب سے مال گزاری اور لگان میں ایک اور دو کی نسبت کم از کم ہوتی ہے۔ زمیندار پارٹی اس پر تیار تھی کہ ہر ایک روپیہ کی رعایت کے بدلہ جو گورنمنٹ کی مال گزاری میں کی جائے۔ وہ کم از کم دو روپیہ کاشتکار کے حق میں چھوڑنے کو تیار رہے۔ مسٹر اسمتھ فنانس ممبر اس موقع کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہم اضلاع سے اطلاع مانگ رہے ہیں۔ ان کی تقریر کے حسب ذیل فقرے سے سر جارج لیمبرٹ اور ان کی پالیسی کا پتہ چلتا ہے۔

"as cleary explained by me to this house last month. Govt. can not possibly efford to throw away any Rupee of Revenue to which it is justly entitled and which it is able to collect.

میں نے اور سر جگدیش نے بار بار اس طرف توجہ دلائی۔ لیکن مسٹر اسمتھ کو موقع کی اہمیت کا اندازہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس غلطی کی بدولت سر جارج لیمبرٹ مستقل گورنر بنائے گئے اور مسٹر اسمتھ پھر فنانس ممبر نہ ہوسکے۔

انتظام ملک کو کامیاب بنانے میں صرف سامنے آئی چیزوں پر غور کرنا کافی نہیں بلکہ آنے والے واقعات کی پیش بینی اور پیش بندی دونوں بہت ضروری ہیں۔

اس موقع پر فوری احکامات کی ضرورت تھی نہ کہ تحقیقات کی۔ ملک میں گاندھی ارون مصالحت

کی بنا پر کچھ سکون ہو گیا تھا۔ لیکن اس غلطی نے ہیجان کو زندہ رکھا۔ سول نافرمانی کے بجائے ہیجان نے لگان کی ادائیگی دشوار کر دی۔ اس کونسل میں ایک ریزولیوشن سر سی۔ وائی چنتامنی نے رکھا جو متفقہ طور پر پاس ہوا۔ یہ رزولیوشن گول میز کانفرنس پر تھا اور اس میں لارڈ ارون کا گاندھی ارون پیکٹ پر شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اور یہ خواہش کی گئی تھی کہ آئین مروجہ کے تحت جس قدر ممکن ہو ہندوستان کو اختیارات تفویض کر دئے جائیں۔

چنتامنی یوں بھی اچھے مقرر تھے۔ اس روز کی تقریر بہت خوب تھی۔ ہر طرف سے داد ملی۔ چوں کہ محرک نے بحیثیت ممبر گول میز کانفرنس اپنی تقریر میں میرا بھی نام لیا تھا۔ میں نے بھی تقریر کی۔ جس کا اختصار کے ساتھ ترجمہ بے موقع نہ ہوگا۔

اپنے زمانے کی دو سب سے بڑی شخصیتوں سے متعلق یعنی لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی جس توصیف و تعریف کا اظہار محرک نے کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سے ہمنوا پاتا ہوں۔ اس مصالحت سے ملک میں امن قائم ہو گیا۔ میں لارڈ ارون کو ہندوستان کا بڑا محسن سمجھتا ہوں۔ محرک اس سے بخوبی واقف ہیں کہ اس فضا کو پیدا کرنے میں لارڈ ارون کو انگلستان اور ہندوستان میں کتنی زبردست دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں لارڈ ارون سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحبت میں برائی کا خیال تک ہم نشیں کے دل میں نہیں آتا۔ مہاتما جی کے بارے میں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ "مادر ہند کے بہترین فرزند ہیں' ایسے فرزند کہ جن پر مادر ہند کو خود فخر ہے"۔

میرے دوست محرک نے اس کی خواہش کی ہے کہ گول میز کانفرنس کی بدولت جو اہل انگلستان کے خیالات میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ میں اس کی تصدیق کروں۔ جب ہم انگلستان پہنچے تو وہاں کی فضا میں ایک طرف مایوسی تھی اور دوسری طرف بے اعتمادی۔ ایک طرف شکوک تھے تو دوسری طرف توہمات۔ خود لارڈ ارون اور ان کی سیاست پر نکتہ چینی ہوتی تھی اور ہندوستانیوں کو ان کی طرفداری کرنی پڑتی تھی۔ لیکن جب ہم واپس ہوئے ہیں تو فضا بدلی ہوئی تھی۔ مایوسی کے بجائے امید کی جھلک نظر آتی تھی اور توہمات کے بجائے اس کا اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ ہندوستان ترقی کے راستہ

پر چلنے کے لئے تیار ہے۔"

"اس کے بعد میں نے مسٹر رمزے میگڈانل وزیر اعظم۔ مسٹر وجیح وڈ بین وزیر ہند اور مسٹر بالڈون کا شکریہ ادا کیا کہ ان کا طرز عمل ہندوستان کی طرف ہمدردانہ رہا تھا۔ میں نے ان کے ثبوت میں گول میز کانفرنس میں مفید کام ہوا یہ کہا کہ مہاتما جی اور دوسرے بڑے لیڈروں کا شرکت پر اب راضی ہونا اس کا ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک ایسی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں کہ جن پر ایک اچھی عمارت بن سکے۔ پھر میں نے سر تیج بہادر سپرو کے لئے کہا۔ سر تیج نے ایک آزمودہ کار جنرل کی قابلیت کے ساتھ ہندوستان کی جنگ لڑی اور جس فیاضی اور وسعت نظر کا اظہار سر تیج نے (کمیونل معاملات میں) کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر چند اور ایسے لیڈر ہندوستان میں ہوں تو ہندوستان کی (کمیونل گتھی جلد سلجھ جائے۔" کونسل گورنر کے حکم سے ملتوی ہو گئی۔

یو۔پی کی حکومت نے بعجلت تمام قیدیوں کی رہائی شروع کر دی۔ آخر مارچ میں تقریباً پانچ ہزار قیدی رہا ہو چکے تھے۔

لیکن لگان میں کمی کا سوال زیر بحث تھا۔ سر جارج لیمرٹا بھی اسے محسوس کرنے لگے تھے کہ مالگزاری اور لگان کم کئے بغیر کام نہ چلے گا۔ لیکن وہ دل سے مال گزاری میں کمی کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ سر مالکم ہیلی بھی ولایت سے واپس آ گئے اور فوراً مال گزاری میں اکسٹھ لاکھ کی کمی کا اعلان کیا گیا۔ سر مائیکل کین کی صدارت میں ایک کمیٹی بیٹھی کہ وہ مزید غور اور تحقیقات کے بعد مال گزاری کی سفارش کرے۔ جس نسبت سے زمیندار کو مال گزاری میں کمی دی گئی اسی نسبت کے کاشتکار کے لگان میں کمی کی گئی۔

ہم لوگ نینی تال آ گئے۔ سول نافرمانی بند کر دی گئی تھی مگر ملک میں ہیجان کافی تھا۔ جو لوگ بم اور گولی کی مدد کے بغیر ہندوستان کی آزادی کو ناممکن خیال کرتے تھے وہ اپنے خفیہ پروگرام پر عمل کرنے لگے۔ ریلوں پر ڈاکے ڈالے گئے۔ کئی جگہ افسروں پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ بمبئی کے گورنر سر ارنسٹ ہوٹسن پر گولی چلی گو یہ بچ گئے۔ علی پور میں ایک جج صاحب گولی سے قتل کئے گئے۔ پنجاب میں فوجی افسروں پر حملہ ہوا جس میں سے ایک مارے گئے۔ (ایک خان بہادر پولیس انسپکٹر ڈھاکہ

ہیں مارے گئے اور بہت ایسے واقعات ہوئے۔

جرائم کا یہ طریقہ بنگال میں زیادہ رہا۔ اور یو۔پی میں ایسا نہیں ہوا۔ لیکن انتظامی در و بست پر اس کا سایہ پڑنے لگا تھا۔

میرا اسٹیڈو

انھیں دنوں میں نے دیکھا کہ ایک اجنبی شخص اکثر میرے پیچھے چلتا ہے۔ لیکن کچھ فاصلہ سے۔ ایک دو روز تو میں نے خیال نہ کیا۔ لیکن پھر میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ حفاظت کے خیال سے میرے ساتھ کیا گیا ہے۔ جنھیں سٹیڈو کہتے ہیں۔ اُن کی جیب میں ایک تپنچہ رہتا ہے۔ جس کے چلانے میں یہ بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ میں نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور اب دنیا کے مزید تجربے کے بعد یہ خیال کرتا ہوں کہ میری رائے کس قدر ناد انی پر مبنی تھی۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بدیشی حکام کو ایسی حفاظت کی ضرورت ہے اور ایسی احتیاط ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن میں تو ہندوستانی ہوں۔ اگر میرا انتظام اتنا بُرا ہے اور میرا طور طریقہ ہم وطنوں کے ساتھ اتنا نفرت انگیز ہے کہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہیں۔ تو پھر زندگی کا کیا لطف اور یہ نہیں ہے تو وہ میرے قتل کی سازش کیوں کریں گے۔ آج مہاتما جی کے قتل اور ملک میں ہزارہا بے گناہوں کی خوں ریزی دیکھنے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ میں کس قدر ناسمجھ تھا۔ میری نظر انسانی فطرت کے فقط ایک ہی پہلو پر پڑتی تھی۔ میرے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہ آتی تھی کہ سفا کی اور شیطنت میں بھی انسان اپنی ہی مثال تھا۔ بہر حال رائے غلط تھی یا صحیح۔ میں ہوم ممبر تھا انسپکٹر جنرل کو میرا کہنا ماننا پڑا۔ اور سٹیڈو سے میرا پیچھا چھوٹا۔

دیہات پر اقتصادی اثر

دیہات پر اناج کی قیمت گر جانے کا بہت بُرا اثر تھا۔ لگان اتنا زیادہ تھا کہ کاشتکار ادا نہیں کر سکتا تھا۔ بعض زمینداروں نے بغیر گورنمنٹ کا انتظار کئے اپنے کاشتکاروں کے لگان میں کمی کر دی تھی مگر حال

خال ایسا ہوا تھا۔ میں نے بھی شاید ۲۵ فی صدی کمی کی تھی مگر حالات کے لحاظ سے یہ کمی ناکافی تھی۔ پہلی صاحب نے آتے ہی مال گزاری میں کمی کردی۔ اور قانون کے تحت اسی تناسب کے لحاظ سے لگان میں کمی ہوگئی۔ یہ نسبت ایک اور تین تھی۔ زمینداروں نے ۲۰۷۱۳۷۴۲ کی کمی کاشتکار کو دی۔ حکومت نے زمینداروں کو مبلغ ۷۵۸۷۵۲۶ روپیہ کی مال گزاری میں کمی دی۔ لیکن اس سے زیادہ کمی کی ضرورت تھی اور آئندہ کی گئی۔

دیہات میں ایک طرف تو قیمتوں کے گرنے سے کاشتکار مصیبت میں تھا۔ دوسری جانب باوجود "گاندھی اروِن" معاہدہ کے کاشتکاروں کا (جن کی تعداد ستر بہتر فی صدی ہے) کانگریس کا ساتھ نہ دینا گویا پارٹی کے سیاسی مستقبل کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ لہٰذا گاؤں میں شورش شروع ہوگئی۔

حکومت کی دشواریاں قابلِ لحاظ تھیں۔ وہ کسی ایک ہی پارٹی کی خوشنودی کی طالب نہ تھی۔ اس کے سامنے تین پارٹیاں تھیں۔ کاشتکار۔ زمیندار اور عام ٹیکس ادا کرنے والا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ کاشتکار اور زمیندار کے درمیان جو متفقہ لگان تھا وہ ناقابلِ وصول ہوگیا تھا۔ اسی لئے ایک حد تک لگان اور مال گزاری میں کمی کردی گئی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ مستقبل کے واسطے کیا اصول یا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں کسی پارٹی کو معقول وجہ شکایت نہ ہو۔ مختلف زمینوں کا لگان اور مالگزاری۔ مختلف اقسامِ زمین۔ مختلف حالات اور مختلف نوعیت کاشت پر منحصر تھی۔ بعض جگہ اونچی قوموں کے لگان کچھ کم ہوتے تھے۔ اس واسطے کہ وہ مزدوروں سے کھیتی کراتے تھے۔ آخر کس اصول پر کمی کی جائے۔ کیا لگان کو اتنا کم کردیا جائے جتنا اس زمانے میں تھا جبکہ اجناس کی قیمت یہی تھی یا اس عام ارزانی کے نقصان کا کچھ حصہ کاشتکار بھی برداشت کرے۔ پھر یہ کہ کمی سب پر یکساں ہو یا کاشتکار اور کھاتہ کی حالت کے مطابق الگ الگ تجویز کی جائے۔
کاشتکاروں کا لگان یکساں نہ تھا۔ مثلاً صوبہ آگرہ میں موروثی اور غیر موروثی کے لگان میں بڑا فرق تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ گذشتہ تیس سال قبل اجناس کا نرخ تقریباً یہی تھا جو ۱۹۳۱ء میں ہوگیا تھا لیکن اس تیس برس میں موروثی کاشتکاروں کے لگان میں جھانسی ڈویژن میں ۴ فی صدی اضافہ سے

لے کر میرٹھ ۵۰ فی صدی تک ہوا تھا۔ ہر ڈویژن کی حالت الگ الگ تھی۔ بخلاف اس کے غیر موروثی کاشتکاروں کے لگان میں اضافہ جھانسی ڈویژن میں ۲۵ فی صدی سے لے کر روہیل کھنڈ میں ۱۵۳ فی صدی تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسا اصول بنانا جو ان تمام اختلافات کے باوجود تمام کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے منصفانہ فیصلہ ہو آسان نہ تھا۔ یکساں کمی ان حالات میں ناممکن تھی۔

اقتصادی پس منظر کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف چند ماہ قبل ملک میں سول نافرمانی بڑے زور سے چل رہی تھی۔ کاشتکاروں سے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ لگان مت دو۔ "گاندھی ارون" معاہدہ کے بعد وہ تحریک روکی گئی مگر فوراً ہی قیمتیں گرنے کی وجہ سے کاشتکاروں سے کہا گیا کہ تم اتنا ہی لگان دو جتنا کہ آسانی سے دے سکتے ہو۔ دیہات میں جلسے کئے گئے جس میں ہزارہا کاشتکار جمع ہوتے تھے۔ ان تقاریر میں زمینداروں کے خلاف بھی تقریریں ہوتی تھیں۔ اس کا اثر کاشتکار کے دل و دماغ پر کیا ہوا محتاج بیان نہیں۔ چند ماہ قبل سول نافرمانی کے زمانہ کی آواز "لگان مت دو" اب تک ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اقتصادی حالت سے وہ پریشان تھا۔ تحریروں اور تقریروں میں کہا گیا کہ زمیندار اس کا خون چوستے ہیں۔ ادھر زمیندار لگان وصول کرنا چاہتا تھا نتیجہ وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہونا چاہیئے۔ اقتصادی الجھن کے ساتھ امن و امان میں بھی خلل آگیا۔ بعض اضلاع میں زمینداروں اور ان کے ملازمین پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ کہیں کہیں عمال حکومت کی زد و کوب کی گئی۔ ان حالات کے ماتحت میری تکالیف اور دشواریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان واقعات کی بنا پر گورنمنٹ کو کانگریس سے اور کانگریس کو گورنمنٹ سے شکایت تھی کہ معاہدہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ پھر گفت و شنید ہوئی۔ اور آخر کار مہاتما جی اس پر راضی ہو گئے کہ کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے وہ گول میز کانفرنس میں شریک ہوں گے۔ ۲۹ اگست کو مہاتما جی بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی انگلستان کے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

دوسری گول میز کانفرنس

شروع ستمبر میں پھر ولایت کو روانہ ہوا۔ اس بار میرے ہمراہ خان بہادر کپتان محمد رضا مرحوم تھے۔ بہت خوب انسان تھے۔ معمولی درجہ سے غیر معمولی درجہ تک ترقی کی۔ نواب عبدالسمیع خاں کے ہم جماعت تھے۔ انہی کے پاس رہتے تھے۔ بے منت غیرے خاں صاحب ہوئے۔ خان بہادر ہوئے۔ ٹیریٹوریل فوج میں کپتان ہو گئے۔ میرے خیال میں ان کی ترقی کا راز ان کی ان صفات میں پوشیدہ تھا۔ جب کسی کام کو ہاتھ میں لیتے تو اس دھن سے شروع کرتے کہ اسی کے ہو جاتے۔ اپنے محسن کے وفادار تھے۔ خدا غریق رحمت کرے۔ نواب بہادر کے ساتھ حج کو جا رہے تھے۔ جہاز میں انتقال ہو گیا۔

ہم P.H.O سے روانہ ہوئے۔ ملوجا جہاز کا نام تھا۔ اسی جہاز سے سر علی اور لیڈی امام۔ سر اقبال۔ شفیع داؤدی بھی سفر کر رہے تھے۔ یہ تین نئے ممبر تھے جو پہلی کانفرنس میں شامل نہ تھے۔ حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم بھی ساتھ تھے۔

یہ جہاز بہت بڑا اور آرام دہ تھا۔ میں نے کیبن ڈی لکس لیا تھا جو بہت ہی کشادہ اور آرام دہ تھا۔ حافظ ہدایت حسین مرحوم کو میں نے اپنے ہی کیبن میں لے لیا تھا۔

یہ چند روز جو اس جہاز میں گزرے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایسی پر لطف صحبتیں کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ ہر روز مختلف مسائل پر نئے پہلو سے گفتگو ہوتی۔ ہر روز ذہنی اور دماغی ترقی کا احساس ہوتا تھا۔ ادبی اعتبار سے یہ صحبتیں بڑی بلند پایہ تھیں۔

سر علی امام مرحوم

سر علی ہر لحاظ سے اپنے زمانے کے قابل ترین ہندوستانیوں میں سے ایک تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے کونسلر رہے۔ "لا ممبر" کی حیثیت سے ان کا علمی مرتبہ مسلمہ تھا۔ مقرر ایسے کہ جب تقریر کرتے تو ایسا معلوم

ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ انگریزی اردو دونوں زبانوں میں بڑی اچھی تقریر ہوتی تھی۔ پرانی تہذیب اخلاق، مروت اور انکسار کا بہترین نمونہ تھے۔ آج ایسے حضرات کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ دورانِ گفتگو میں طرزِ بیان بہت دل کش اور الفاظ کا انتخاب بہت پاکیزہ ہوتا تھا۔ قصص و حکایات اور اساتذۂ قدیم کا کلام نوکِ زبان رہتا۔ جو گفتگو کو اور بھی دلچسپ بنا دیتا تھا۔ اس سفر میں سر علی مرحوم اور لیڈی امام دونوں مجھ پر کرم خاص فرماتے رہے۔ ولایت جانے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد سر علی امام مرحوم بہت بیمار ہو گئے۔ انھیں درد قولنج ہوا اور اسی کے ساتھ کچھ قلب کی بھی شکایت ہو گئی۔ میں دن میں ایک بار ضرور جاتا تھا۔ لیڈی علی امام کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ گو حالت بہت نازک ہو گئی تھی۔ مگر خدا نے اپنا فضل فرمایا۔ اور اتنی صحت ہو گئی کہ وہ ہندوستان واپس جا سکے۔

سر محمد اقبال

سر محمد اقبال کو کون نہیں جانتا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ جتنا بلند ہے محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے کلام پر سینکڑوں مضامین اور مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اُن کا کلام خود اُن کی زبان سے ہر روز سننا جہاز کی پُرسکون فضا میں ایک ایسا پُرکیف سماں ہوتا تھا کہ جس کا اندازہ فقط وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھیں قدرت نے ذوقِ سلیم عطا کیا ہے۔ ہم سب ایک شعر بار بار سنتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اس زمانے کا ان کا کلام زیادہ تر فارسی زبان میں تھا۔ ان کی گفتگو میں پنجابی تلفظ اور طرز ادا کی جھلک نظر آتی تھی۔

میرا معمول یہ تھا کہ علی الصباح نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈیک پر چلا جاتا تھا۔ وہاں مہاراجہ میسور کے چھوٹے بھائی یو راج بھی آ جاتے۔ ہم دونوں بھاگ کر جہاز کے تین چار چکر لیتے۔ پھر کچھ ٹہلتے۔ اس کے بعد اپنے کیبن میں آ کر غسل کرتا۔ رضا مرحوم علی الصباح آ جاتے تھے۔ مجھے وضو کراتے۔ نئے کپڑے نکالتے اور راحت رسانی کی ہر کوشش کرتے تھے۔ پھر آٹھ بجے میں بریک فاسٹ کے واسطے کھانے کے کمرے میں چلا جاتا۔ اب جہاز میں اور لوگ بھی بیدار ہو گئے ہوتے تو ساڑھے نو بجے تک سر علی امام سر

محمد اقبال۔ حافظ ہدایت حسین۔ شفیع داؤدی (خدا ان سب کو جوارِ رحمت میں جگہ دے) اور میں ڈیک پر آرام کرسیاں لے کر بیٹھ جاتے۔ کسی علمی۔ سیاسی یا ادبی مضمون پر گفتگو شروع ہو جاتی۔ لینچ تک یہ جلسہ رہتا۔ پھر ہم سب ساتھ لینچ کھاتے اور کچھ دیر آرام کرتے۔ سوائے اس وقت کے جب میں ٹینس یا اور کوئی ورزش کرتا تھا۔ باقی تمام وقت انہی صحبتوں میں گذرتا تھا۔

ایک روز سر علی امام مرحوم نے ایک قصہ سنایا۔ وہ لا ممبر تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کی ذیل کی مشہور نظم کا انگریزی ترجمہ سر علی نے لارڈ ہارڈنگ کو دیا۔

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی
کہ یہ رشتہ عروسی کشور آرائی کا زیور تھا

تو خود فرماندہِ جے پور نے نسبت کی خواہش کی
اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ دیہیم و لشکر تھا

ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشۂ اکبر
گئے انبیر تک جو تختگاہِ ملک و کشور تھا

ادھر راجہ کی نورِ دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی
اُدھر شہزادہ پر چترِ عروسی سایہ گستر تھا

دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے
کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا

دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے
وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا۔ ظالم تھا ستمگر تھا

بارِ دگر جب سر علی امام مرحوم لارڈ ہارڈنگ سے ملے تو ویسرائے نے اُن سے جو کہا وہ الفاظ بجنسہ تو مجھے یاد نہ رہے مگر منشا یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی۔ ہمیں ابھی ایک ہی صدی ہوئی مگر ہماری سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔

اس بار ہم لوگ مارسیلز پر جہاز سے اترے۔ وہاں سے پیرس کو گاڑی سہ پہر کو جاتی تھی۔ سر محمد اقبال۔ شفیع داؤدی اور حافظ ہدایت حسین مرحومین کی رائے ہوئی کہ چونکہ ریل کی روانگی کے وقت میں دیر

تھی۔ شہر کی سیر کی جائے۔ میں نے بڑے شد و مد سے تائید کی۔

ہم ایک گائڈ یا رہنما کو لے کر چلے۔ یہ ضرور دشواری تھی کہ ہمارا گائڈ انگریزی سے کچھ زیادہ واقف نہ تھا اور ہم لوگ فرانسیسی سے واقف نہ تھے۔ منجملہ دوسرے مقامات کے ہم ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں سٹیج پر ایسی حیا سوز برہنگی دیکھی کہ مجھے سخت حیرت تھی کہ فرانسیسی جیسی متمدن اور مہذب قوم ایسی حرکتیں کیسے روا رکھتی ہے۔

ہم فرانس سے کیلے ہوتے ہوئے لندن پہنچے۔ اسٹیشن پر حکومت کے صیغۂ میزبانی کے افسر موجود تھے۔ اور پہلی بار جو میری پرائیویٹ سکریٹری تھی وہ ہی موجود تھی اس بار میرا قیام قصر بکنگھم کے قریب سینٹ جیمس کورٹ میں تھا۔ یہ بہت آرام دہ عمارت تھی۔ کمرہ نہایت کشادہ اور نہایت نفیس تھا۔

میں دو کمیٹیوں کا ممبر تھا۔ کمیٹی ۲ جس کا مقصد یہ تھا کہ صوبوں کے واسطے آئین بنایا جائے کمیٹی ۳ جس کا مقصد اقلیت قوموں کی حفاظت کے طریقے وضع کرنا تھا۔

اقلیتوں کے حقوق

۲۸ ستمبر کو اس کا جلسہ شروع ہوا۔ مسٹر رمزے میکڈانل وزیر اعظم نے اپنی شروع تقریر میں حسب ذیل الفاظ میں اس کا اعتراف کیا کہ یہ سوال سال گذشتہ طے نہ ہو سکا اور اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

"جب گذشتہ بار ہم جمع ہوئے تھے تو میں صفائی سے کہہ سکتا ہوں اور جو اس وقت موجود تھے وہ صفائی سے اس کا اقرار کریں گے کہ اقلیتوں کے مسئلہ نے ہمیں پریشان رکھا۔ میرا یہ خیال تھا کہ یہ مسئلہ آپ کا خانگی مسئلہ ہے اور آپ کو خود طے کرنا چاہیئے۔ میں نے جب بھی آپ سے اپیل کی تھی اور اب پھر اپیل کرتا ہوں کہ اقلیتوں کے تحفظات کے اس مسئلہ کو طے کیجئے تاکہ سب مطمئن ہو جائیں۔

اس جلسہ میں ہز ہائی نس آغا خان نے کہا کہ "آج شب کو مہاتما جی کچھ مسلمانوں سے مل رہے

ہیں۔ میں کسی گفت و شنید کے متعلق اس وقت اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔ مالوی جی نے بھی کہا کہ ایسی گفتگو ہندو مسلم سوال اور دوسری اقلیتوں کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس واسطے اس میٹنگ کو ملتوی کرنا مناسب ہوگا۔ میٹنگ ملتوی ہوگئی۔

لیکن ڈاکٹر امبیدکر اور کرنل گاڈنی نے اسے صاف کر دیا کہ کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان اگر کوئی معاہدہ ہوتا ہے تو ہم اس کے پابند نہیں ہیں۔

پہلی اکتوبر کو پھر میٹنگ ہوئی۔ اس میں مہاتما جی نے ہز ہائی نس آغا خان کے مشورے سے یہ خواہش کی کہ میٹنگ کو ایک ہفتہ کے لیئے ملتوی کر دیا جائے۔ ہز ہائی نس و اکثر حضرات نے مہاتما جی سے یہ خواہش کی تھی کہ مختلف جماعتوں کے لوگوں کو بلا کر وہ گفتگو کریں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک شب قبل رٹز ہوٹل میں مہاتما جی مسلمانوں سے ملے تھے۔

بدقسمتی سے میری ڈائری اس سفر کی گم ہوگئی۔ لہذا سرکاری رپورٹوں سے مدد لے رہا ہوں مگر وہ چنداں دلچسپ نہیں۔ حافظہ میں خاص خاص واقعات محفوظ ہیں مگر ان کی تفصیلات یاد نہیں۔

مہاتما جی سے مسلمانوں کی گفتگو

مہاتما جی اور مسلمانوں سے پہلی ملاقات ہز ہائی نس کے کمرے میں رٹز میں ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ مہاتما جی نے یہ خواہش کی کہ مسلمان حکومت برطانیہ سے کہیں کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کو بھی بلالیا جائے۔ سوائے سر علی امام کے نیشنلسٹ مسلمانوں کا کوئی اور نمائندہ نہ تھا۔ مہاتما جی کے الفاظ کا منشا یہ تھا کہ میرے پر نہیں ہیں تو کیسے اڑوں۔ میرے خیال میں مہاتما جی کا اصرار سچا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے کوئی فیصلہ ایسے مسلمانوں کی غیر موجودگی میں ہو جو ان کے ساتھ رہے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت کے برے بنے اور انگریزوں کے ہاتھوں تکلیفیں برداشت کیں۔ مسلمان لیڈروں کا خیال تھا کہ ہم کیوں گورنمنٹ سے خواہش کریں۔ ممبروں کو دعوت نامہ ہماری رائے سے نہیں بھیجے گئے

پھر ہم ایسی خواہش کیوں کریں۔ مسٹر جناح مرحوم و مغفور میرے برابر بیٹھے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ مہاتما جی کی اس خواہش کو مان لینے میں کیا ہرج ۔ تو مسٹر جناح مرحوم نے پلٹ کر فرمایا۔

"I can forgive an enemy, but I cannot forgive a traitor."

مجھے اپنے پرانے کاغذات میں چند کاغذ ملے جن میں ان کا ذکر ہے جو مہاتما جی اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ مہاتما جی کی پہلی تجویز یہ تھی۔ ۲۸ ستمبر

"That the embargo on Dr. Ansari should be lifted till then it will not be of any use to make any serious efforts for the settlement of the Hindu Muslim question.

اس تجویز پر ۲۸ ستمبر کی تاریخ ہے۔ اس کے بعد ۲۹ ستمبر کو مہاتما جی کی طرف سے یہ تجویز ہے۔

"Doctor Ansari agreeing, I shall be prepared to endorse the Muslim demands and endeavour to utmost of my ability to get it accepted by all parties with the active assistance of the Muslim friends. Dr. Ansari's assistance is vital for me as I should be able to make no progress without him.

مسلمانوں نے اس کے جواب میں ۳۰ اکتوبر کو جب مہاتما جی اُن سے ملنے آئے تو یہ formula پیش کیا۔

"I endorse the Muslim demands which are annexed hereto and shall endeavour to the utmost of my ability to get them accepted by all parties including Dr. Ansari and his party. I request the Muslims to help me by withdrawing their objections to Dr. Ansari's nomination to the Round Table Conference, as his assistance is vital for me."

مہاتما جی نے اس Formula کو پسند نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا اس تجویز میں ان پر بہت زیادہ بوجھ بے جا طور پر ڈالا جا رہا ہے۔ پھر مسلمانوں نے مہاتما جی کے سامنے حسب ذیل فارمولا پیش کیا

"I wish that the Muslman should withdraw their objections to Dr. Ansari's nomination to the Round Table conference and I will endeavour to the utmost of my ability to persuade him to accept the Muslim demands specified herein after. P re the event of his withholding his consent to them I shall stand by them and do my best with the help of Moslims to persude all other parties to accept them."

یہ تجویز مہاتما جی کو دی گئی اور سوا بارہ بجے رات مہاتما جی ہوٹل سے چلے گئے۔
اس کے بعد مسلمانوں نے ہز ہائی نس آغا خان۔ مسٹر جناح۔ سر میاں محمد شفیع اور مولانا شوکت علی کو منتخب کیا کہ وہ مزید گفتگو مہاتما جی سے جاری رکھیں۔
اوپر کی انگریزی کی تجاویز میں نے اس گشتی مسودہ سے نقل کی ہیں کہ جو مجھے سر شفاعت احمد مرحوم نے بحیثیت سکریٹری مسلم ڈیلیگیشن بھیجی تھیں۔
گو اب پاکستان کے بننے کے بعد تصویر بالکل بدل گئی لیکن یہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اگر ایسی ہی ایک اور گشتی مسودہ کی نقل شامل کر دوں جس سے معلوم ہو کہ مسلمانوں کا مطالبہ کیا تھا جسے مہاتما جی بعض ترمیمات کے ساتھ قبول کرنے کو تیار تھے۔ مہاتما جی نے reconcile کا لفظ استعمال کیا تھا جس کے معنی میری رائے میں رضی ہونا نہیں بلکہ با دلِ ناخواستہ مان لینا ہیں۔

Terms of October 5th, 1931

1—MUSLIM PROPOSALS

1. In the Punjab and Bengal bare majority of one percent of

Musalmans, but the question of whether it should be by joint electorates and reservations of 51 % of the whole house, should be referred to Musalman voters before the New Constitution comes into force, and their verdict should be accepted.

2. In other Provinces where the Musalman are in a minority the present weightage enjoyed by them to continue, but whether the seats should be reserved to a joint electorate, or whether they should have separate electorates, should be determined by the Musalman voters by a referrandum under the New Consitution, and their verdict should be accepted.

3. That Musalman representative in the Central Legislature u both houses should be 1/3 of whole house, 20% of the whole house to be elected by the Musalmans in British India and at least 7% by convention should be Musalmans out of the quota that may be assigned to the Indian States making a total representation of the Musalmans 1/3 in each house.

4. That the residuary power should vest in the fedrating provinces of British India.

5. That the other points as follows being agreed :—

1. Sindh 2. N.W.F. Provinces. 3. Services 4. Cabinet.
5. Fundamental rights and safeguards for religion and culture.
6. Safeguards against legislation affecting any community.

Mr. GANDHI'S PROPOSAL

1. That the Frenchise be on the basis of adult suffrage.
2. No special reservations to any orher community save Sikhs and Hindu minorities.
3. The Congress demands :—
   (a) Complete Independence.
   (b) Complete control over the defence immediately.
   (c) Complete control over external affairs.
   (d) Complete control over finance.
   (e) Investigation of public debts and other obligations by an independent tribunal.
   (f) As in the case of partnership, right of either party to terminate it

2—THREE ALTERNATIVES :—

1. As regards acceptance by the respective parties, and the Congress, of the four Muslim demands with referrendum on the basis of adult suffrage in place of the present for separate electorate, the acceptance of the Muslims of the Congress mandate, and the resistance to the further extension of special provision for minorities including untouchables, on the ground already explained
2. Or. The acceptance by the Muslims of Sir Geoffrey Corbett's scheme so far as the Punjab is concerned.
3. Or. Reference of the respective demands of the three parties to arbitration from amongst ourselves.

۸ راکتوبر کو ایک ہفتہ گذر نے پر مہاتما جی نے کمیٹی کی میٹنگ میں اظہار افسوس کیا کہ کمیونل قضیہ طے نہ ہوگا۔ لیکن سلسلۂ گفتگو اس کے بعد بھی جاری رہا۔

مہاتما جی نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر کانگریس مسلمانوں کی خواہشات مان لے تو انھیں

(۱) ہندوستان کی خودمختاری میں (جس میں مالیات۔ فوج۔ امور خارجہ شامل ہیں) کانگریس کا ساتھ دینا چاہیئے۔

(۲) ہندوستان کو یہ حق ہوگا۔ (جیسا کہ ہر شراکت میں ہوتا ہے) کہ جب چاہے امپائر سے الگ ہو جائے اور یہی حق انگلستان کو ہوگا۔

(۳) یہ کہ سوائے سکھوں کے اور ہندو اقلیت کسی اور اقلیت کے جداگانہ انتخاب کے مسلمان بھی خلاف رہیں۔

میں نے ان چیزوں کو ذرا تفصیل سے اس واسطے لکھا کہ ہم اس ملک کو اس زمانہ میں کہاں لے جانا چاہتے تھے اور اس زمانہ میں وہ کہاں پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکے۔

مہاتما جی نے یہ بجا طور پر صاف کر دیا کہ جو فیصلہ ہوگا اسے وہ فوراً کانگریس ورکنگ کمیٹی میں پیش کریں گے۔ وہ کانگریس کو پابند نہیں کر سکتے گو مسلمان نمائندہ مسلمانوں کی طرف سے فیصلہ کو تیار تھے اور چاہتے تھے کہ مہاتما جی بھی ایسا ہی کریں۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ مہاتما جی کی رائے نامناسب نہ تھی۔ وہ کانگریس کو پابند نہیں کر سکتے تھے۔ گو مجھے اس کا یقین ہے کہ اس زمانہ کی کانگریس پر مہاتما جی کا اتنا اثر تھا کہ ان کے عہد و پیمان سے کانگریس روگردان نہ ہوتی۔

مسلمانوں کی ذہنیت یا زاویۂ نظر یہ تھا۔

(۱) اگر ہم نے فیصلہ کر لیا اور کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے نہ مانا تو ہمارے تاش کے پتے پہلے ہی کھیل جائیں گے۔ اور اگر آخری فیصلہ حکومت برطانیہ ہی کو کرنا پڑا تو وہ اس سے متاثر ہوگی۔

(۲) مسلمان ڈومینین اسٹیٹس سے زیادہ آگے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس طرح سوچتا تھا اگر قانون میں حقوق ملے بھی تو کون اس کا ذمہ لے گا کہ جو کچھ قانوناً ملا ہے وہ عملاً بھی مل جائے۔ لہذا اس کے

تصور میں ایسے گورنر جنرل کی ضرورت تھی جو الیکشن کا محتاج نہ ہو اور کسی سیاسی جماعت کا مرہونِ
منت نہ ہو۔

(۳) وہ اس پر تیار نہ تھے کہ اور فریق خاص کر اچھوت اگر جداگانہ نمائندگی چاہیں تو وہ ان
کی مخالفت کریں جبکہ وہ اسی چیز کو اپنے واسطے طلب کر رہے ہوں۔

آخر کار مہاتما جی نے ۸ ر اکتوبر کو کمیٹی کے جلسے میں اظہار کر دیا کہ ان کی کوشش ناکام رہی۔
اس پر سب طرف سے تقاریر میں اظہارِ افسوس کیا گیا۔

اس کمیٹی کی سفارشات کا نتیجہ یہ تھا کہ سوائے پارسی حضرات کو جو علیحدہ نمائندگی نہیں چاہتے
تھے۔ اچھوت، مسلمان، سکھ، عیسائی سب کے لئے جداگانہ نمائندگی کی سفارش کی گئی۔

اس میٹنگ میں ہز ہائی نس آغا خان نے ایک تقریر کے ساتھ وزیر اعظم کو ایک اقرار نامہ دیا۔
ہز ہائی نس کی تقریر کے شروع کے الفاظ یہ تھے۔

Mr. Prime Minister on behalf of the Mohammaden, the depressed classes, the Anglo Indians, the Europeans and a consisiderable section of Indian Christian groups I present the document embodying the agreement which has been arrived at between them with regard to the intercommunal problem with which the Round Table Conference in general and the minorities committee in particular are concerned."

ایک روز رٹز ہوٹل میں مسلمانوں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ آغا خان اور دیگر ممبران موجود تھے کہ سر
محمد اقبال مرحوم نے نہایت غصّہ کے ساتھ ہز ہائی نس سے کہا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ہماری جماعت میں ایسے
لوگ موجود ہیں جو وزیر ہند سے ہماری تجویز کی اطلاع کرتے ہیں اور ہمارے جلسوں کا ہر راز وزیر ہند

پر منکشف ہو جاتا ہے۔ یہ الزام اتنا سخت تھا کہ تمام ممبران نے اس پر اصرار کیا کہ ایسے شخص کا نام ظاہر کیا جائے۔ اس اصرار پر سر محمد اقبال مرحوم نے ایک صاحب کی طرف (خدا انھیں غریق رحمت کرے) اشارہ کرتے ہوئے ایک نا ملائم لفظ کا استعمال کیا اور کہا کہ "یہ ... ... جا کر کہتا ہے" ان مرحوم پر کیا گزری وہ تو ان کا دل ہی بتا سکتا تھا مگر تمام ممبران میں غصہ کے ساتھ شرمندگی کا بھی احساس تھا۔

انگلستان میں ۱۹۳۱ء کا انتخاب

ان دنوں کساد بازاری اور بے کاری دنیا میں ہر طرف پھیل رہی تھی۔ بے روزگار لوگوں کے جلوس لندن میں نکلتے تھے۔ ہندوستان میں چیزوں کی قیمتیں اتنی ارزاں تھیں کہ گیہوں کا نرخ سترہ اٹھارہ سیر فی روپیہ ہو گیا تھا۔ امریکہ میں بھی دولت کی اس قدر فراوانی کے باوجود بے روزگاری کی شکایت تھی انگلستان میں مزدور پارٹی کی حکومت تھی۔ گو پارلیمنٹ میں مزدوروں کی اکثریت نہ تھی لیکن لبرل مزدور پارٹی کی مدد کر رہے تھے اور اس طرح یہ حکومت چل رہی تھی۔ ۳۱ء میں جنرل الکشن ہوا۔

میں لندن میں تھا۔ اس میں کنسرویٹو کی بڑی اکثریت آئی لیکن حکومت کسی ایک جماعت نے نہیں بنائی بلکہ قومی حکومت بنی جس کے وزیر اعظم مسٹر رمزے میگڈانل رہے۔ مجھے یاد ہے کہ مزدور پارٹی کی تعداد بہت ہی کم آئی تھی لیکن اقتصادی دشواریاں تمام دنیا پر اس طرح چھائی ہوئی تھیں کہ مسٹر بالڈون نے اسے پسند کیا کہ بجائے خود وزیر اعظم ہونے کے مسٹر رمزے میگڈانل کو وزیر اعظم رکھیں اور اسی طرح قومی حکومت بنائیں۔

میرے خیال میں مسٹر بالڈون کی یہ مثال قابل تقلید ہے۔ میں اکثر خیال کیا کرتا ہوں کہ اگر ۳۷ء کے انتخاب کے بعد ہندوستان کے اکثر صوبوں خاصکر یو۔پی میں پارٹی کی گورنمنٹ بنانے کے بجائے کانگریس نے قومی گورنمنٹ بنائی ہوتی تو آج ہماری زندگی کا کیا نقشہ ہوتا۔

عوام کا سیاسی شعور

جس روز ولایت میں ۱۹۳۱ء کے انتخاب کے پرچے پڑ رہے تھے میرے موٹر ڈرائیور نے مجھ سے ۲ گھنٹہ کی چھٹی طلب کی۔ وجہ بیان کی کہ اُسے رائے دینے جانا ہے۔ مجھے دلچسپی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ کس حلقہ میں رائے دو گے۔ اس نے کہا کہ چلسیا میں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہاں سے سر سیموئل ہور کھڑے ہو رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اگر ہرج نہ ہو تو یہ بھی بتا دو کہ کس کے حق میں رائے دینے کا ارادہ ہے۔ مجھے حیرت ہوئی جب اس نے سر سیموئل ہور کا نام لیا۔ میں نے پوچھا کہ تم مزدور اور وہ کنسرویٹو۔ تمہارا ان کا کیا ناتا۔ اس نے جواب دیا "ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں مزدور ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ کنسرویٹو انتظام کرنا ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ پارلیمنٹری حکومت بہت سے ممالک میں ہے لیکن جتنی انگلستان میں (شاہی کے باوجود) کامیاب ہوئی اتنی اکثر دوسرے ممالک میں نہ ہوئی۔ اس کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ ایک معمولی موٹر ڈرائیور کا یہ فیصلہ کہ اس کی رائے میں اس کی ہم پیشہ مزدور پارٹی مخالف پارٹی سے حکومت کرنے کی اہلیت کم رکھتی ہے اس لئے اس کی رائے مخالف پارٹی کے لئے ہو سیاسی شعور اور آزادئ رائے کی بڑی قابلِ تقلید مثال ہے

قدرتاً میرا ذہن اپنے ملک کی طرف پلٹا۔ کیا ہندوستان میں سیاسی شعور اتنا ہے کہ یہاں کے عوام الناس جمہوریت کو چلا سکیں۔ کیا اُن میں آزادی کے ساتھ رائے قائم کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ کیا یہ سیاسی جماعتوں کے نعروں کا شکار نہ ہو جائیں گے۔ کیا بلا امتیاز مذہب و ملت یہ رائے کا استعمال کریں گے۔ کچھ اس طرح کی باتیں میرے ذہن میں تھیں جن کی بنا پر میں ایوانِ اعلیٰ کا وجود ہندوستان کے لئے ضروری خیال کرتا تھا۔

صوبائی آئین

الیکشن کا زمانہ ایسا تھا جس میں انگلستان کے باشندوں کو الیکشن کے علاوہ کوئی دھن نہ تھی

ہمارے لئے بھی تعطیل رہی۔

جدید گورنمنٹ کی تشکیل کے بعد پھر کام شروع ہوا۔ دوسری کمیٹی جس کا میں ممبر تھا وہ صوبائی آئین بنانے کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ اس کے چیرمین مسٹر ہنڈرسن تھے۔

صوبائی آئین بنانے کے سلسلہ میں برٹش نمائندے اس پر زور دیتے تھے کہ ملازم سرکاری بھی وزیر بنایا جاسکے۔ (یہ سائمن کمیشن کی سفارش تھی) مجھے اس سے اختلاف تھا۔ دوسرا امر گورنر کے خصوصی اختیارات تھے۔ میں خاص حالات میں ان کی موافقت میں تھا۔ اصل میں وہی دشواری یہاں بھی حائل تھی جو ہر جگہ تھی۔ یعنی اقلیتوں کا تحفظ ہو۔ اس کے علاوہ اگر ملک کا امن وامان خطرے میں ہو تو گورنر کو مداخلت کا اختیار ہو۔ میرے نقطۂ نظر کی وضاحت میری ایک تقریر سے ہوسکتی ہے جس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE

3rd Meeting of Sub-Committee No. 2, held on 8th December 1930

Speaker, Sir Ahmad Said Khan, Nawab Chhattari

Mr. Chairman, on the first point I can only say that I agree with those speakers who are in favour of abolishing dyarchy from the provinces. I may say with reference to what Lord Zetland has just said on the subject of transfer of law and order that although I agree vuth him to some extent it is not for the reasons stated by his Lordship. He said thae if the portfolio of law and order is in charge of an Indian sucb a minister would not be able to administer the department as impartially as a European could. I do not agree with that, nor do I think there would be any lack of efficiency. Here I may say that in one of the major provinces which stands next only to Bengal as far as population is concerned the portfolio of law and order has remained incharge of an Indian for the last ten years. Fortunate-

ly the leader of opposition of my Council is also a member of this Sub-committee; and I think he will be able to bear me out when I say that not once has any criticism been made in the house or outside it about the impartiality of the Member in charge of law and order .... Of course, there may be other grounds for misgivings on the part of the minority, but to meet those misgivings I am sure safeguards can be embodied in the Constitution instead of perpetuating dyarchy in the Province........

....

In regard to the composition of the Legislative Council I think there should be no official Block, but I think it would be desirable if we allowed official members to come to the House and explain the position whenever necessary. My experience has shown me that some time it happens that questions of such detail are asked in the House that it is difficult for the member in charge of the department to be able to reply without the help of the officials of the Department. It would be of great help therefore, if officials were allowed to explain the matter in the House, but they should have no right of voting. As to the compositon of the Ministry, in my opinion the appointment of the Chief Minister should be left to convention. I for one would not like to have that put in the constitution and made rigid. I know that in practice there must always be a Chief Minister The Governor will have to consult the most influencial man and that man automatically will become Chief Minister. But if we were to make that rigid by stating in the Constitution that there will be a Chief Minister it is quite possible there might be difficulty in forming a Ministry in India. The reason is this, it is perfectly

easy to do it if there is a party system as there is in England. You have two parties or three parties. You take the leader of the majority party and make him the Chief Minister. But in India political parties have not crystalised as yet. In the Legislative Council, as far as experience goes, there is the group system. There is a group of ten or twenty here and a group of ten or twenty there, representing various schools of thoughts. There is no party system. If we insisted that there should be a Chief Minister we might, therefore, have some difficulty. I for one would much prefer to leave the matter open as is done in many other constitutions. For instance, in the English constitution I do not think there is any mention of a Prime Minister. In many constitutions there is no mention of a Prime Minister or a Chief Minister...... ....

.... As to the question of officials becoming members of a Ministry, I am entirely opposed to any official Minister. It is simply impracticable. It will crewt weakness inside the Govehment. It will not be a source of strength in any way . . ..

. ...

There is one other point upon which I should like to lay stress and that is about safeguarding of minorities, by giving some seats in the Cabinet to minorities. I think there would be difficulty in putting such a provision in the constitution, but I think it could easily be put into the Instrument of Instruction, to the Governors. It may be against the notions of democratic Government, but there are special circumstances in India and we must try to create a feeling of security in the minds of minorities. Therefore, I think it would be desirable; indeed, I think, that in the Instrument of Instruction.

we should make it quite clear that the Governor would do his very best to include the members of minority in the Cabinet. This question of minorities, if I may be allowed with your permission to say so, need not be regarded as a question of Muselman minorities. It is not so. If we seek to protect the rights of minorities we do not seek in that way to favour Musalmans. In that respect I was very much impressed by the speech of Raja Narendra Nath from the Punjab, who is a very zealous member of the Hindu Mahasabha. The question of minorities is simply a question of doing justice to the weaker party, whether Hindu or Muslim.

ROUND TABLE CONFERENCE

Fourth Meeting of Sub-Committee No. 2 (Provincial Constitution), held on 9th December, 1930

Now comming to the special power of the Governor, I beg to submit that I do not wish to take the position taken by Dr. Ambedkar this morning; I think he indicated a certain suggestion and refuted it at one and the same time; for instance, he started by saying that he agreed that minorities should be protected but said that these powers should not be given to the Governor, that they should be put in the statute. Sir, if no man is going to exercise those powers how are those words of the statute going to protect minorities. Some body would have to exercise those powers and that should be the Governor; therefore the powers are bound to be put in the hands of the Governor, there can be no other authority to exercise them. Similarly with regards to the preservation of tranquality and peace in the Province, while he disagreed with giving power to the Governor, he proposed

that if there is any breach of peace the Governor should be allowed to have all the postings of officers in his own hands. That mean that he should be allowed to usurp all the functions of the Home Minister and the Home Minister for the time being would become a nonentity in the Cabinet. I think, Sir, that instead of doing this it would be much better, as was suggested by the Simon Commission and by many other gentlemen here, that these powers should be given to the Governor to interfere in these departments. I know that any reservation of powers in the hands of the Governor is contrary to the notion of self Governmsnt it is difficu't to reconcile the idea of autonomous Provinces on the one hand with the special powers of the Governor on the other hand; still, situated as we are, we have got to make a constitution for a country in which there are difficulties. We wish to face those difficulties and to draw up a Constitution which may be suitable for that country. I should like, to quote the words of a Nationslist of the Type of Mr. Shastri when addressing the East Indian Association about these powers; he said this:—"Though great powers are reserved for the Governor, the cases in which he may use them are carefully defined; they are (1) In order to preserve the safety or tranquility of the Province or (2) in order to prevent serious prejudice to one or more sections of the community as compared with other sections. Exception may be taken to the second catagory of powers as being likely to create occasion for undue exercise; but it is necessary to introduce a sense of contentment and security in the minority communities and we must bring ourselves to acquiesce in it" When a Nationalist of Mr. Sastri's type is willing to agree to it, I do not think that any of us should have any objection to those powers being given to the Governor.

سر مالکم ہیلی سے خط و کتابت

گو میں لندن میں تھا لیکن سر مالکم ہیلی (اب لارڈ ہیلی ہیں) سے مراسلت جاری تھی۔ وہ مجھے صوبے کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔

لارڈ ہیلی نے مجھے لکھا کہ مہاراج کنوار مہی جیت سنگھ کو اپنی مہلک علالت کی بنا پر استعفیٰ دینا پڑا ان کے بجائے کوئی اور وزیر ہو یا صرف دو وزرار کافی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تیسرے وزیر کی ضرورت نہیں انھوں نے ۳۰ر اکتوبر کے خط میں مجھ کو اس سے بھی مطلع کیا کہ چار کروڑ دس لاکھ کی تخفیف کاشتکاروں کے لئے لگان میں کر دی گئی۔ لیکن زمینداروں کو اسی نسبت سے مالگذاری میں تخفیف نہ دی جا سکی۔ زمینداروں کو مالگذاری میں فقط ایک کرور کی تخفیف دی گئی۔ حالانکہ حساب سے ایک کرور چھیالیس لاکھ ہونی چاہئے تھی۔ میں نے جواب میں ان کی تجاویز سے اتفاق کیا۔

یو۔پی کی حکومت نے جس اصول پر تخفیف لگان کاشتکاروں اور تخفیف مال گزاری زمینداروں کی وہ انصاف پر مبنی تھا۔ حکومت نے لگان تقریباً وہی رکھا جو کاشتکار ان گزشتہ سالوں میں دے رہا تھا جب اناج کا وہی نرخ تھا جو ۱۹۳۰-۳۱ء میں ہو گیا تھا۔ یہ نرخ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء میں تھا۔ لگان اتنا ہی کر دیا گیا۔ اس تخفیف لگان کے باوجود کانگرس ایجی ٹیشن کرتی رہی۔ الہ آباد کے ضلع میں اس کا خاص طور پر بہت زور رہا لیکن انصافاً کسی ایجی ٹیشن کی گنجائش نہ تھی۔

لارڈ ہیلی نے ۱۲ر نومبر کے خط میں مجھے لکھا کہ سر جارج لیمبرٹ نے استعفیٰ دیدیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ آسام میں گورنر کے تقرر کا موقع آیا تو وائسرائے نے یو۔پی سے سر مائیکل کین کے تقرر کی سفارش کی اور وہ مقرر ہو گئے۔ اس بنا پر سر جارج مستعفی ہو گئے۔ سر مائیکل کین ان سے جونیر تھے۔

سر جارج کے مستقل گورنر نہ ہونے کی ایک وجہ کانپور کا بلوہ تھا جس کا تذکرہ آچکا ہے۔ دوسری وجہ ارزانی نرخ کے باوجود ان کا لگان و مال گذاری کم کرنے میں پس و پیش کرنا تھا۔ نرخ کی ارزانی نے دراصل ایک ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ اس کا تدارک فوراً نہ کیا جاتا تو دیہات میں انقلابی کیفیت یقیناً

پیدا ہو جاتی - ایسے موقع پر تاخیر پالیسی وضع کرنا انتظامی درو بست کے اعتبار سے خطرناک غلطی ہے
علاج تو جلد یا بدیر کرنا ہی پڑتا ہے - لیکن تاخیر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے - جن لوگوں کی آپ رعایت کرنا چاہتے
ہیں وہ رعایت کے بعد بھی آپ کے ممنون نہیں ہوتے بلکہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی شورش کا یہ انعام
ہے - پھر وہ اپنا دوست حکومت کو نہیں بلکہ ان حضرات کو خیال کرنے لگتے ہیں جو شورش کا مشورہ دیتے ہیں

سر جارج لیمبرٹ کے چلے جانے کا اثر ختم ہوا - (۲ نومبر کے خط میں لارڈ ہیلی نے مجھے لکھا) -
بسلسلہ خط گذشتہ جس میں میں نے سر جارج لیمبرٹ کے متعلق تمہیں مطلع کیا تھا - مجھے اندیشہ ہے
کہ مجھے کچھ اور تبدیلیوں کا ذکر بھی تم سے کرنا ہے -

میں نے راز میں کنور جگدیش پرشاد کو بتایا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں بلنٹ کا نام کی سفارش سر
جارج لیمبرٹ کی جانشینی کے واسطے کروں - وہ جگدیش پرشاد سے دو برس سینیر ہیں اور ایسے معاملات
میں یہ چیز بہت اثر رکھتی ہے - بہرحال جگدیش پرشاد کا یہ خیال ہے کہ چونکہ وہ چیف سکریٹری ہو گئے جبکہ بلنٹ
فنانس سکریٹری تھے - لہذا اس وقت ان کا فنانس ممبر ہونا ان کی پوزیشن پر اثر انداز ہوتا ہے - مجھے
افسوس ہوتا ہے کہ میں اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کرتا - ہر شخص جانتا ہے کہ ہم دو برس سینیر ہونے کو نظرانداز
نہیں کر سکتے -

مجھے اس خبر سے تشویش ہوئی - لیکن ظاہر ہے کہ میں ولایت میں بیٹھ کر کیا کر سکتا تھا - نومبر سے
جگدیش پرشاد نے سولہ ماہ کی چھٹی لے لی - جس کے بعد وہ پنشن پر آئی سی ایس سے سبکدوش ہو گئے -
اسی خط میں لارڈ ہیلی نے مجھے یہ بھی لکھا کہ انھوں نے مسٹر ہیگ کو لکھا تھا لیکن جب انھوں نے منظور
نہ کیا - تو لارڈ ہیلی نے سر جوزف کلے کو چیف سکریٹری مقرر کیا -

اس خط میں لارڈ ہیلی نے یہ بھی لکھا تھا کہ کانگریس نے ضلع الہ آباد میں لوگوں سے لگان ادا کرنے
کو منع کیا - جب تک گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان گفتگو ختم ہو - یو - پی گورنمنٹ نے یہ بھی مان لیا کہ
جہاں تک صرف الہ آباد کے ضلع کے لگان کا تعلق تھا - لیڈران کانگریس اور الہ آباد کے کلکٹر اور کمشنر
گفت و شنید کریں لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو کانگریس کا مطالبہ ہوا کہ تمام صوبہ میں بجائے چار کروڑ

چھیالیس لاکھ کے آٹھ کرور تخفیف کی جائے۔ اور یہ کانفرنس ختم ہو گئی۔
میری یہ رائے تھی کہ کانگریس کا یہ مطالبہ سیاسی اغراض کی بنا پر تو ٹھیک تھا لیکن اقتصادی نقطۂ نظر سے صحیح نہ تھا۔ یو۔پی گورنمنٹ کا یہ نظریہ بالکل منصفانہ تھا کہ لگان اتنا ہی کر دیا جائے جتنا تقریباً اُس زمانہ میں تھا جب کہ اجناس کا نرخ اسی کے لگ بھگ تھا۔

مہاتما جی سے ملاقات

میں نے مسز نائیڈو کے توسط سے مہاتما جی سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ مسز نائیڈو مجھے اپنے ہمراہ لے کر گئیں۔ مہاتما جی فرش پر بیٹھے شب کا کھانا نوش فرما رہے تھے۔ کچھ دودھ، انگور اور کھجوریں تھیں۔ ممکن ہے کچھ اور پھل ہوں مگر یاد نہیں۔
مہاتما جی نے مجھے کچھ کھجوریں دیں۔ میں نے بھی کھانی شروع کر دیں۔ میں نے خاص طور پر یو۔پی کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ کاشتکاروں کے لئے لگان میں مناسب کمی کر دی گئی ہے لیکن کانگریس پھر بھی ادائگی لگان میں مزاحم ہوتی ہے۔ مہاتما جی نے جواباً جو فرمایا اس کا منشا یہ تھا کہ ذاتی طور پر انھیں یو۔پی کے حالات سے واقفیت نہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ لگان میں جتنی کمی کو یو۔پی کی حکومت مناسب خیال کرتی ہو کانگریس اُسے کم خیال کرتی ہو۔ میں نے کہا کہ یہ تو آپ کا فرمانا درست ہے کہ ایک ہی تجویز کو ایک کافی اور دوسرا ناکافی خیال کر سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کی خدمت میں یہ بات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ سنہ ۱۹۰۱ء و ۱۹۰۲ء میں اناج کے نرخ اور لگان میں جو نسبت تھی تخفیف لگان کے بعد وہی پھر آگئی ہے۔ اس کے بعد میں نے حکومت یو۔پی کی تجویز صراحت کی۔ مہاتما جی نے فرمایا کہ یہ تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔
یوں اس سے قبل بھی مجھے مہاتما جی سے ملنے کا موقع ہوا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ملاقات تو دو تین ہی آدمیوں میں ہوتی ہے ورنہ ایک مجمع میں ملنا تو ملاقات نہیں فقط درشن ہوتے ہیں۔ اس دفعہ درحقیقت ملاقات ہوئی۔
یہ تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ مہاتما جی کی شخصیت ایسی تھی کہ صدیوں کے بعد کبھی ایسے اشخاص قدرت

پیدا کرتی ہے اور شاعر نے سچ کہا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں　　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

یوں تو مہاتما جی میں، پنڈت موتی لال نہرو جیسی نظر کی تیزی اور ذہن کی ادراکی بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسز نائیڈو اور رائٹ آنریبل شاستری کی طرح فصیح البیان نہ تھے۔ نہ سر تیج بہادر سپرو جیسا قانونی تبحر تھا۔ لیکن ان میں کچھ ایسی ناقابل بیان قوت تسخیر یا جاذبیت تھی کہ مخلوق ان کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی۔ ان کے مسکرانے میں بچوں جیسی معصومیت اور شگفتگی جھلکتی تھی۔ ان کے سیدھے اور سہل الفاظ دل میں اتر تے چلے جاتے تھے وہ اپنی رائے کے اظہار میں بہت بے باک تھے۔ یہی نہیں کہ حکومت کے مقابل اپنے خیالات بغیر اندیشہ دار و رسن بیان کرتے تھے۔ یہ صفت سیاسی لیڈروں میں کم ہوتی ہے۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ ان کے خلاف ہو جائیں گے۔ وہ صحیح معنوں میں رہبری کرتے تھے۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ سچائی کا اعلان کرنا بغیر کسی خطرے کی پرواہ کئے وہ اپنا فرض خیال کرتے تھے اور اس ادائیگی فرض میں اپنی جان تک دیدی۔

مجھے اس کے بعد کئی بار شرف نیاز حاصل ہوا۔ میں نے ایک خاص بات ان کی محفل میں محسوس کی ان کے علاوہ یہی کیفیت میں نے ایک اور شخص کی ہم نشینی میں بھی پائی۔ انسان کتنا ہی متفکر یا پریشان کیوں نہ ہو۔ مہاتما جی کی محفل میں ایک سکون کی فضا محسوس ہوتی تھی۔ میں جب کبھی گیا مجھے اس کا احساس ہوا انھیں دشمنی کسی سے ہوتی ہی نہ تھی۔ ان کے مضامین یا ان کی تقاریر میں میں نے کبھی نفرت یا دشمنی کا رنگ نہیں پایا۔ عوام الناس پر ان کا اثر حیرت انگیز تھا۔ لوگ انتخاب کے موقع پر محض ان کے نام پر رائے دیتے تھے۔ کانگریس کی سیاسی طاقت کا راز ان کا ہر دل عزیز ہونا تھا۔

مسز نائیڈو:

جانتا تو میں پہلے سے تھا۔ لیکن اس گول میز کانفرنس کے دوران میں مسز نائیڈو سے خاصی شناسائی ہوگئی جو آخر دوستی کی حد تک پہنچ کر جب میں ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد گیا تھا تو یگانگت کی صورت میں بدل گئی

وہ اور ان کی صاحبزادیاں پدماجا اور مس لیلامنی میرے گھر کے لوگوں اور مجھ پر خاص عنایت کرتی تھیں بالکل گھر کے سے تعلقات تھے۔

میں نے مسز نائیڈو کو جتنا زیادہ قریب سے دیکھا اتنا ہی زیادہ میں ان کا مداح اور ثنا خواں ہو گیا۔

وہ ایک زبردست مقرر بلند پایہ ادیب۔ بے شک شاعرہ تھیں۔ ان کی ان صفات سے تعلیم یافتہ ہندوستان کا ہر فرد واقف ہے۔ وہ دل کی بڑی اچھی اور سچی تھیں۔ میں نے اُن کے جلسے میں بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو کسی شخص کا ذکر برائی سے کرتے ہوتے یا کسی کی غلط کاری پر نفریں و ملامت میں مشغول ہوتے۔ لیکن مسز نائیڈو ہمیشہ اس کے فعل کو اچھی تعبیر سے نباہتیں۔ یا کم از کم اس کی نیت پر شبہ نہ کرتیں۔ بڑی سخی اور مہمان نواز تھیں۔ جب گورنر یو۔پی ہو کر آئیں تو ان کا دسترخوان اتنا وسیع تھا جس کی دوسری مثال یو۔پی کے گورنمنٹ ہاؤس کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔

ان کا وطن حیدرآباد ہے حیدرآباد کے لوگوں کے ساتھ بڑی لطف و محبت کے ساتھ پیش آتی تھیں وہ جب کبھی حضور نظام سے ملیں تو ہر بات صفائی کے ساتھ بیان کرتیں۔ وہ دل سے حیدرآباد کی ریاست اور نظام کی بہتر طلب تھیں۔

ایک بار مسز نائیڈو کی سالگرہ کے موقع پر حضور نظام کو پیام تہنیت بھیجنے کا خیال پیدا ہوا میں اس زمانے میں حیدرآباد میں تھا۔ اعلیٰ حضرت نے میری رائے دریافت فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ مناسب ہے۔ اس کے جواب میں مسز نائیڈو نے ایک بہت ہی پُر خلوص خط حضور نظام کو لکھا اس خط میں ایک موقع پر نظام کے واسطے "My Ruler" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ جس سے حضور نظام بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں حاضر ہوا تو وہ خط اعلیٰ حضرت نے مجھے دکھایا میں نے اس خط کی بہت تعریف کی یہاں تک تو کوئی بات نہ تھی لیکن فوراً ہی اعلیٰ حضرت نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اپنے پیام اور مسز نائیڈو کے جواب کو اخبار میں چھپوا دیں۔ مجھے اس میں بدرجہ غایت تامل تھا۔ اول تو میں کسی ایسی تحریر یا تقریر کو جو نجی طریقے سے لکھی یا بیان کی گئی ہو منظر عام پر

لانا نامناسب خیال کرتا ہوں لکھنے والے کو لکھتے وقت اس کا علم ہونا چاہیے کہ اس کی تحریر شائع ہوگی یا اس کے شائع ہونا ممکن ہے۔ نجی گفتگو یا تحریر ایک طرح کی امانت ہوتی ہے جس کا احترام لازمی ہے۔ غرض کچھ رد و قدح کے بعد اعلیٰ حضرت نے میری بات مان لی۔

۱۹۴۷ء میں نائیڈو یو۔پی کی گورنر ہوئیں۔ ہر حلقہ میں مقبول اور محبوب تھیں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں لکھنؤ گیا ہوں اور ان کے ساتھ کھانا نہ کھایا ہو۔ مجھ سے فرماتیں تم دعوت نامہ کا انتظار کیوں کیا کرتے ہو۔ جب دل چاہا۔ اے۔ ڈی۔سی کو فون کر دیا کہ فلاں وقت کا کھانا میں گورنمنٹ ہاؤس میں کھاؤں گا۔

میں نے یہ ہمیشہ دیکھا کہ جو کمزور ہوتا مسز نائیڈو اس کی طرفدار ہوتیں۔ کیسا ہی خاطی ہو۔ اگر شرمندۂ خطا ہے تو مسز نائیڈو ضرور معاف کر دیتیں۔

ایک بار لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس میں لنچ پر مدعو تھا۔ مسز نائیڈو کے پاؤں میں تکلیف تھی۔ صوفہ پر پاؤں پھیلائے بیٹھی تھیں۔ انھیں دنوں حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تھا۔ وہ حیدرآباد کی حالت پر افسوس کر رہی تھیں۔ فرما رہی تھیں کہ اگر تمھاری تجاویز مان لی ہوتیں تو حیدرآباد کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اتنے میں ایک خاتون آئیں جو مسز نائیڈو کے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ وہ "آنٹی" (خالہ) کہہ کر مسز نائیڈو کو مخاطب کرتی تھیں مزاج پرسی کے بعد اُن خاتون نے مسز نائیڈو کو مبارکباد دی۔

مسز نائیڈو۔ کس بات پر

وہ ۔ حیدرآباد پر

مسز نائیڈو حیدرآباد میرا وطن ہے۔ وہاں کے لوگوں پر اگر کوئی مصیبت آئی تو مبارکباد کا کیا موقع ہے۔ پھر دیر تک وہ یہی کہتی رہیں کہ کاش اہلِ حیدرآباد نے ان کی (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) بات مان لی ہوتی انھیں حکومت ہند کی پالیسی سے حرف بحرف اتفاق تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ حکومتِ ہند کو آخرکار پولیس ایکشن لینا پڑ گیا۔ لیکن انھیں اس کا قلق بھی تھا کہ وہاں کے لوگوں پر مصیبت ٹوٹی۔

ان کی مختلف صفات میں جو صفت قوی ترین تھی وہ مادری صفت تھی۔ انھیں ہر دُکھی سے ایسی ہمدردی ہوتی تھی گویا مظلوم انہی کے خاندان کا ایک رکن تھا۔

ان کا وجود خواتین ہند کے واسطے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھا۔ ان کے انتقال نے ایک ایسا خلا پیدا کیا ہے جو صدیوں ممکن ہے پُر نہ ہو۔

دوسری کانفرنس کا آخری جلسہ

آخرکار یہ گول میز کانفرنس بھی ختم ہوئی۔ ۲۸ نومبر کو اس کا آخری اجلاس شروع ہوا۔ تقریباً ہر ممبر نے کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا۔ لیکن جو دائمی طور پر ہندوستان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتا تھا وہ یا تو وزیر اعظم کا آخری بیان تھا یا مہاتما جی کی تقریر تھی۔ اور حضرات کی بھی تقاریر ہوئیں جو باوجود اپنی تمام خوبیوں کے بیکار رہیں۔ اُن سے نہ تو برطانیہ کی پالیسی متاثر ہوتی تھی نہ کانگریس کی۔

وزیر اعظم کی تقریر کا خود مرکز گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء تھا۔ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں صرف چند فقرات یہاں درج کر رہا ہوں جو اقلیت کے مسئلہ سے متعلق تھے۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE

2nd meeting 2nd Plenory Meeting

(30th November 1930)

We must all, however, realise that there stands in the way of progress, whether for the Province or the Centre that formidable obstacle, the communal dead-lock. I have never concealed from you my conviction that this is, above all others, a problem for you to settle by agreement amongst yourselves. The first of the privileges and the burden of a self-governing people is to agree how the democratic principles are to be applied, or, in other words, who are to be represented and how it is to be done. This conference twice essayed this task; twice has it failed. I cannot believe that you will demand that we shall accept these, failures as final representation and conclu-

But time presses. We shall soon find that our endeavours to proceed with our plans are held up (indeed, they have been held up already), if you cannot present us with a settlement acceptable to all parties as the foundation upon which to build. In that event His Majesty's Government would be compelled to apply a provisional scheme, for they are determined that even this disability shall not be permitted to be a bar to progress. This would mean that His Majesty's Government would have to settle for you, not only your problems of representation, but also to decide as wisely and justly as possible what checks and balances the constitution is to contain to protect minorities from an unrestricted and tyranical use of the democratic principle expressing itself solely though majority power.

مہاتما جی نے نہایت صفائی اور دلیری سے کانگریس کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ ان کی تقریر میں سب سے بڑے خوبی یہ تھی کہ کانگریس کی طاقت اہلِ ملک پر اس جماعت کا اثر اور اس کے عزم و عزیمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی صلح کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تقریبا اعلانِ جنگ بھی تھی اور دعوتِ صلح بھی۔ وہ تقریر درحقیقت بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ مہاتما جی نے اس موقع پر اپنی تقریر میں فرمایا۔

"The Congress represents the spirit of rebellion."

اسی تقریر کا ایک حصہ حسب ذیل ہے

Plenary session, 30th November 1931

ROUND TABLE CONFERENCE SECOND SESSION

I suggest to you, Prime Minister, it is too late today to resist this, and it is this thing which weighs me down. this choice that lies

before them, the parting of ways probably. I shall hope against hope, I shall strain every nerve to achieve an honourable settlement for my country if I can do so without having to put the millions of my countrymen and even children to this orceal of fire. It can be a matter of no joy and comfort to lead them on again to a fight of that character, but if a further ordeal of fire has to be our lot. I shall approach that with the greatest joy and with greateet consolation that I was doing what I considered right, the country was doing what it felt to be right, and the country will have the additional satisfaction of knowing that it was not at least taking lives, it was giving lives; it was not making the British people directly suffer, it was suffering.

مجاہد کو دیکھا مصلح کو بھی دیکھئے۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE

2nd Meeting, 2nd Plenart Meeting

(30th November 1930)

I do not want to break the bond between England and India, but I do want to transform that slavery into complete freedom for my country. Call it complete independence or whatever you like, I will not quarrel about that word, and even though my countrymen may dispute with me for having taken some other word I shall be able to

bear down that opposition so long as the content of the word that you suggest to me bears the same meaning.

مہاتما جی کی تقریر کے بعد اس ملک کی اکثریت کا فیصلہ ظاہر ہو گیا تھا۔
میں نے بھی اظہار خیال کیا تھا۔ مہاتما جی سے پہلے ہی میری باری نہ آ چکی ہوتی تو شاید تقریر بھی نہ کرتا۔
مہاتما جی کی تقریر کے بعد کانفرنس پر اوس سی پڑ گئی۔
میں نے اپنی تقریر میں فرقہ وارانہ سوال پر یہ کہا تھا کہ جہاں تک مسلمانوں کے مطالبات کا تعلق ہے
ڈاکٹر انصاری مرحوم کی فرید پور کی تقریر اور مسلم کانفرنس کی قرارداد کو اگر برابر رکھ کر دیکھا جائے تو فقط
اتنا ہی فرق ہے کہ ڈاکٹر انصاری مرحوم مخلوط انتخاب چاہتے ہیں اور مسلم کانفرنس جداگانہ انتخاب کی قائل ہے
میں نے اپنی رائے حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کی تھی۔

INDIA ROUND TABLE CONFERENCE

2nd Meeting Ist Plenary Session
(28th November 1931)

By the Nawab of Chhatari

"As to the question of separate electorates, my position is the same today as it was last year on the Ist January, when I spoke on

the question in the Minorities Sub-Committee, namely, that as certain communities insist on separate electorates, it should be given to them. There should be a clause in the Constitution that they can give them up whenever they like of their own free will. After all, separate electorates in themselves are not the goal. When all other safeguards for the Muslim community have been embodied, when they have seen the working of the constitution when they realise that real safety of the minority rests upon the goodwill of the majority more than any thing else, I think they will be willing to give up separate electorates. What we want is to create a feeling of nationalism. Can we create a feeling of nationalism by enforcing upon certain communities a system of electorates against their wishes? My reply is in the emphatic negative. On the other hand, it will make the community concerned morose and angry, and it will create in the minds of the majority that they have got joint electorates not because of the willingness of the minority, but because the minority was too weak to retain them in their hands, if my proposal is adopted, the result will be that it will give the Muslim community the right of selfdetermination, and when the Muslim community agrees to give up separate electorates, the result will be that their Hindu brothren will feel that the Muslims have given up separate electorates to show their implict confidence in the majority. For these reasons I still feel that it is the right way to start off with separate electorates with such a clause in the Constitution.

"We often hear about communal differences, and there is one point that I wish to make very clear, particularly to the members of

His Majesty's Government, on whom the thankless task to decide rests. If we keep the Muslim demands on one side and the resolution of the Working Committee of the Congress on the other side, we shall find that the differences are not so many as they outwardly look. If we read the very lucid note that was circulated the other day by Sir Chiman Lal Sitalvad we shall find that the differences remain only in the Punjab and Bengal. On every other point there seems agreement between the two communities. Therefore, thankless as the task may seem it is not such a tremendous task for the Government, and I hope they will be able to settle it once for all."

میں نے اپنی تقریر میں اس پر بھی زور دیا تھا کہ ایک شہری کے بنیادی حقوق میں اس کی حق ملکیت کا بھی تحفظ ہو۔ بغیر معاوضہ کسی کی ملکیت پر قبضہ نہ کیا جائے۔
میں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی تھی۔

INDIAN ROUND TABLE CONFERENCE

2nd Session, First Plenary Meeting

(28th November 1931)

"I think the solution of the Indian problem rests in All India Federation; and I hope it will be possible for you, Sir to continue this work out in India so that you my be able to complete the full conistrusction of an All India Federation, which I am sure will

enable India to take her place with other free nations in the British Commonwealth, Bound with such silken ties of love that will be far stronger than any iron chains of domination. I am sure that Indian people are getting restless and that it is necessary for the Government to try to satiffy them as soon as possible. I do not mean that we should be hurried into action by any thing that is being done by youngmen thoughtlessly; but at the same time if we really wish to remedy this morbid mentality then the real remedy is that we should be able to create a public opinion in India so much against any action of violence that no body may dare do violence; and such a public opinion can only be created if there is a responsible Government incharge of law and order."

ولایت سے واپسی

آخرکار ولایت سے واپسی کا دن آگیا۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے "ڈوور" ہوتا ہوا پیرس پہنچا۔ یہاں مہاراجکمار ہی جیت سنگھ آنجہانی یو۔پی کی وزارت سے استعفیٰ دے کر بغرض علاج مقیم تھے۔ انھیں کینسر تھا اور جانبر نہ ہوسکے۔ میں "اسٹوریا" ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہ بھی وہیں مقیم تھے۔ اُن سے ملا۔ دو شب پیرس میں ٹھہرا۔ گو مہاراجکمار اس قدر علیل تھے لیکن ان کی زندہ دلی پر اس علالت کا کوئی اثر نہ تھا۔
میں نے کھانا شب کو ان کے ساتھ کھایا۔ کھانے کے بعد باوجود علالت مزاج کے مجھے لے کر چل دیے تین جگہ گئے۔

پیرس میں کہا جاتا ہے کہ یہ شہر رات کے بارہ بجے جاگتا ہے۔ یہ بیان لفظاً بلفظاً درست ہے۔ یہاں رات کے کلب میں۔ جہاں ۔۔رات سب بیدار رقص موسیقی کی سحر انگیزیوں میں طلوع صبح تک گزارتے ہیں کچھ رقص میں مشغول کچھ پینے پلانے میں مصروف۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا پیشہ ہی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تنہا

ہوتو وہ اس کے شریک صحبت ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ناچیں اور مفت شراب پئیں۔ میں شب کو دو بجے اپنے کمرے میں واپس آیا۔

دوسرے روز جہاز انگلینڈ سے رخصت ہو کر مارسیلز کو روانہ ہو گیا۔ بحیرۂ روم اس بار بھی بہت طوفانی تھا۔ گو مجھے سمندر کے تلاطم سے چنداں تکلیف نہیں ہوتی لیکن جہاز پر بڑی اُداسی چھا جاتی ہے۔ مسافر اکثر اپنے اپنے کمروں میں بند رہتے ہیں۔ کوئی کھیل یا تماشہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ لوگ کھانے کے کمرے تک بھی نہیں آسکتے۔ ہوا بہت سرد اور تیز تھی۔ میرا معمول یہ تھا کہ کبھی کھڑکی کے پاس شیشہ کھڑا کر کے بیٹھ جاتا تھا اور گھنٹوں سمندر کی طغیانی کا تماشا دیکھتا رہتا۔ بحیرۂ روم کا پانی یوں بھی ذرا نیلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب آسمان پر بادل چھا رہے ہوں تو تقریباً سیاہ نظر آنے لگتا ہے۔ سامنے سے زبردست موجیں جہاز کی طرف اس طرح بڑھتی تھی کہ بس جہاز کو آغوش میں لے کر بیٹھ ہی جائے گی۔ بعض اوقات منوں پانی جہاز کے اندر آجاتا۔ تند و تیز ہوائیں موجوں کے پرے کے پرے جہاز کی طرف کو بڑھتے ہوئے۔ پوری قوت سے ٹکراتے ہوئے عناصر کی قوت کا ایسا مظاہرہ تھا کہ میں گھنٹوں اسے دیکھتا رہتا۔

پورٹ بند رسعید تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد کا سفر جتنا پُرسکون تھا اتنا ہی غیر دلچسپ بھی تھا۔ زیادہ ہم سفر رومن کیتھلک، پادری اور ننیں تھیں جو مشرقی ممالک میں اپنے مذہب کی خدمت کے واسطے اپنی زندگی وقف کر چکی ہیں۔

میں دسمبر کے آخر تک علی گڑھ پہنچا۔ مجھے بمبئی پہنچتے ہی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ "گاندھی اِرون" مصالحت کا خاتمہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے لیڈر گرفتار ہو چکے تھے۔ مہاتما جی بھی ہفتہ عشرہ کے بعد گرفتار کر لئے گئے۔ ظاہر ہے کہ پھر صلح کیسی۔

میری ہوم ممبری کی توسیع کا سال ختم ہو چکا تھا۔ علی گڑھ میں مجھے سر مالکم ہیلی کا خط ملا کہ چار ماہ کی توسیع قبول کر لوں۔ میرے جانشین کے متعلق کچھ فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ میں نے اسے قبول کر لیا اور نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم سے چارج لے کر لکھنؤ چلا گیا۔

مجھے لکھنؤ گئے دو چار ہی روز ہوئے تھے کہ یکایک سر میاں محمد شفیع کے انتقال کی اطلاع شائع ہوئی ان کا انتقال ۷ جنوری کو ہوا۔ یہ سر میاں فضل حسین مرحوم کے بجائے عارضی ممبر کی حیثیت سے گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر تھے۔ میرے تعلقات مرحوم سے بہت خاص تھے۔ مجھے ان کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔

وبسرائے کی کونسل

دو تین ہی روز کے بعد مجھے سر مالکم ہیلی نے بلایا اور لارڈ ولنگڈن کا تار دکھایا جس میں یہ دریافت کیا گیا تھا۔ کیا میں چند ہفتوں کے لئے سر میاں محمد شفیع کی جگہ پر کرنے کے لئے دہلی جا سکتا ہوں۔ میں نے سر مالکم ہیلی سے کہا کہ یہ تو آپ کے بھی سوچنے کی بات ہے۔ ان کا خیال تھا کہ چند ہفتہ کے واسطے جانے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ میں نے منظور کر لیا اور دہلی روانہ ہو گیا۔ میرا قیام دہلی میں چھ سات ہفتہ رہا۔ لیکن اس قلیل مدت میں مجھے اس کا احساس ضرور ہوا کہ مرکزی حکومت میں ممبران حکومت کے احکامات میں گورنر جنرل اتنی مداخلت نہیں کرتے تھے جتنی صوبجات میں ہوتی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ گورنر جنرل سیدھے ولایت سے آتے تھے۔ اول تو ان کی سیاسی تربیت غیر ضروری مداخلت میں مانع رہتی تھی۔ بخلاف اس کے سوائے بنگال، مدراس اور بمبئی کے تمام گورنر آئی۔ سی۔ ایس افسران میں سے مقرر کئے جاتے تھے۔ برسوں ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے ایک طرف تفصیلی واقفیت بھی ہوتی تھی۔ دوسری طرف ان کی رائے اور پالیسی خاص سانچہ میں ڈھل جاتی تھیں۔ جس سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کرنا نہ اُن کے بس میں ہوتا نہ وہ پسند کر سکتے تھے۔

جس طرح صوبوں میں طریقہ تھا اسی طرح دہلی میں ہر ممبر حکومت کا ایک روز مقرر تھا۔ جب وہ گورنر جنرل کے پاس جا کر امور انتظامی میں مشاورت کرتا تھا۔ میں بھی گیا۔ لارڈ ولنگڈن بڑی گرم جوشی سے ملے۔ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے کرسی تک لے گئے۔ یہ کہتے ہوئے آؤ۔ آؤ اب باتیں کریں۔ اتنے ہی میں ایک چپراسی میرے فائل لے کر داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ہز ایکسیلنسی کے چہرہ پر کچھ تکدر سا ہو گیا۔ میں نے فائلوں کے متعلق کچھ کہا تو انھوں نے یہ کہا کہ انھیں چھوڑ جاؤ۔ میں فائل چھوڑ کر چلا آیا۔ دوسرے ہفتہ جب میں گیا تو میں نے دیکھا کہ

وہ جملہ فائل بجنسہ وہیں رکھے تھے۔ میں یہ کہہ کر ساتھ لے آیا کہ ان پر مناسب احکامات دیدوں گا۔

مجھے اس واقعہ سے اس کا اندازہ ہوا کہ لارڈ ولنگڈن صرف اصولی چیزوں کو طے کرنا چاہتے ہیں۔ اور تفصیلات میں دخل دینا نہیں چاہتے۔ پھر کوئی فائل میں ان کے پاس نہیں لے گیا۔

یہاں ایک یہ بھی طریقہ تھا کہ جو مجھے پسند آیا کہ ہر پندرہ روز کے بعد ایک کیبنٹ ڈنر ہوتا تھا۔ یہ ڈنر باری باری ممبران اپنے مکانوں پر کرتے تھے۔ اس میں سوائے ممبران حکومت کے کوئی اور شخص حتیٰ کہ ان کی بیویاں بھی شامل نہ ہوتی تھیں۔ اس طرح کی ملاقاتوں کے موقع بہت کارآمد ہوتے ہیں۔ آزادی کے ساتھ تبادلۂ خیالات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب میں حیدرآباد میں صدر اعظم تھا۔ تو میں نے اس طرز کو وہاں جاری کرنا چاہا مگر میرے رفقار کار نے اسے دل سے پسند نہ کیا اور کچھ روز کے بعد میں نے بند کر دیا۔

میرے سکرٹیری سرفرینک نوئس اور جوئنٹ سکریٹری رام چندر آئی۔سی۔ایس تھے جس پر خلوص تعاون کا اظہار ان لوگوں نے کیا۔ اس کا اثر اس وقت تک میرے قلب سے محو نہیں ہوا ہے۔ یہ دونوں اپنی سروس کے ممتاز اراکین میں سے تھے۔ سرفرینک تو وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہوئے اور رام چندر پنجاب میں فنانس سکرٹیری اور دہلی میں بھی سکرٹیری رہے۔

کشمیر میں ایجی ٹیشن

کشمیر میں کچھ عرصے سے ایجی ٹیشن ہو رہا تھا۔ مہاراج اور کشمیر کی رعایا کے درمیان اصلاحات کے سلسلہ میں کش مکش ہوئی۔ اس درجہ ہوئی کہ چار مواقع پر مہاراج کی فوجوں کو رعایا پر گولیاں چلانی پڑیں۔ یہ تحریک وہاں عرصہ سے چل رہی تھی۔ پنجاب کی احرار پارٹی بھی اس میں ہمدردی کر رہی تھی۔ اخباروں میں حکومت کشمیر کے خلاف مضامین نکل رہے تھے۔ ایک دن وائسرائے نے یکایک گورنمنٹ کی میٹنگ کا حکم دیا۔ ممبرانِ حکومت جس میں کمانڈر چیف بھی شامل تھے، وائسرائے ہاؤس پہنچے۔ وائسرائے حسب معمول صدارت

کررہے تھے۔ زیر بحث مہاراجہ کا وہ مراسلہ تھا جس میں انھوں نے حکومت ہند سے فوجی امداد طلب کی تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ صورتِ حال اتنی خراب ہو گئی تھی کہ مہاراجہ کی فوج کے قابو سے باہر تھی۔ وائسرائے نے سب سے پہلے کمانڈر انچیف سے پوچھا۔ اس کے بعد وہ ممبران سے ان کی سینیر ہونے کے لحاظ سے رائے دریافت کرتے مجھ تک پہنچے۔ میں سب سے جونیر تھا۔ میرے تمام رفقائے کار کا مشورہ یہ تھا کہ ریاست کشمیر اور حکومت ہند کے درمیان جو معاہدہ ہے اس کے مطابق فوراً فوجی امداد دی جائے۔ میں نے یہ عرض کیا کہ جب کسی سلطنت یا حکومت میں نظم کی حالت خراب ہوتی ہے یا رعایا کو اطمینان اور اعتماد اپنی حکومت پر نہیں رہتا تو آخری نتیجہ وہ ہے جو آج کشمیر میں ہو رہا ہے۔ کشمیر میں یہ حالت عرصہ سے چلی آرہی ہے۔ آج مہاراج نے یہ خواہش کی ہے کہ ہم فوجی مدد دے کر برٹش سنگینوں سے اس شورش کو دبائیں۔ کیا آپ کا یہ فرض نہیں کہ ہم مہاراجہ سے یہ شرط لگائیں کہ جب ہماری فوجیں وہاں جاکر اس شورش کو دبائیں گی تو پھر اصلاحات کے متعلق بھی ہمارے مشورہ پر آپ کو عمل کرنا ہوگا۔ رعایا کی جائز شکایات کا دور کرنا حکومتِ ہند کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی فوجی طاقت سے اس شورش کو مٹاتی ہے۔ میری اس تجویز کو وائسرائے نے پسند کر لیا اور گلانسی صاحب جو پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے ایک ممتاز افسر تھے وہ مقرر کئے گئے مہاراجہ کو اپنی تجاویز ایک رپورٹ کی صورت میں کریں۔

برٹش گورنمنٹ کا یہ اصول تھا کہ وہ اس طرح کے احکام ہندوستانی ریاستوں میں خود کبھی جاری نہیں کرتی تھی بلکہ رئیس پر زور ڈال کر اصلاحی احکامات جاری کرائے جاتے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ کے حکم سے ایک اعلان کیا گیا جس میں سر بی جے گلینسی کو مقرر کیا گیا اور ان کی مدد کے واسطے شاید دو دو ہندو اور مسلم پبلک کے نمائندے ان کے ساتھ شریک کئے گئے۔ اس اعلان میں علاوہ اس کے کہ آئندہ لوگوں کو کس طرح شریک حکومت کیا جائے حسب ذیل عبارت بھی تھی جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض قواعد وضوابط ایسے رائج تھے کہ جو موجودہ زمانے میں تہذیب یافتہ حکومتیں انھیں نامناسب خیال کرتی ہیں۔

ANNOUNCEMENT ISSUED BY HIS HIGHNESS THE MAHARAJA OF KASHMIR

Regarding the enquiry to be held under Mr. Glancy, 1932.

"The first duty of the Commission thus constituted will be to enquire into any complaints which have already been presented to the Darbar, which may be laid before them in regard to any conditions or circumstances which may tend in any way to obstruct the free practice of any religion followed by any community in my State. This part of the enquiry will include the consideration of any claim for the restoration of any building or place now in the possession of the Government which may be regarded by any community as a building or place devoted to the practice of any religion and which has not already been dealt with by previous orders. My Government has no intention of retaining any building or place known to have been devoted to the practice of any religion and steps will be taken for the restoration without delay of those about which there is no dispute. The Commission will also enquire into any secular or civil disability from which any class of my subject may represent that they are suffering in consequence of the religion they profess. ...."

پشاور کا دورہ

مہاتما جی کی گرفتاری کے بعد ایجی ٹیشن بڑے زور سے شروع ہو گیا تھا۔ دہشت پھیلانے والی جماعتیں بھی غافل نہ تھیں۔ ۶ر فروری کو گورنر بنگال پر ایک لڑکی نے گولیاں چلائیں۔ گردوپیش کے ان حالات سے صوبہ سرحد پر اثر پڑا اور سرخ پوش جماعت اور حکومت سرحد میں کشمکش ہو رہی تھی۔

میں ۲۰ر فروری کی شب کو پشاور پہنچا۔ گورنمنٹ ہاؤس میں چیف کمشنر کا مہمان تھا۔ ان دنوں "شاید گریفت" نامی ایک صاحب چیف کمشنر تھے۔ ۲۱ر فروری کی صبح کو میں نے خاص خاص سرکاری اور غیر سرکاری حضرات سے ملاقات کی۔ شام کو اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیز کی طرف سے "ایٹ ہوم" تھا۔ میں نے اسلامیہ کالج کو اپنی ذاتی حیثیت سے پانچ ہزار روپے بطور چندہ دئے۔ یہ سچ ہے کہ خاص مواقع کے تاثرات لازم نہیں کہ حقیقت کے آئینہ دار ہوں۔ پھر بھی میں وہاں کے لڑکوں و استادوں کا ایک اچھا اثر اپنے قلب میں لایا۔

دوسرے روز صبح کو چیف کمشنر کے ساتھ درّہ خیبر دیکھنے گیا۔ جمرود کے قلعہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ دو گاؤں کے لوگوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا اور ایک دوسرے کی تواضع رائفل کی گولیوں سے ہو رہی تھی۔ چونکہ سڑک کی ایک طرف ایک گاؤں تھا اور دوسری جانب دوسرا لہذا دونوں سرداروں کے پاس پیام پہنچایا گیا کہ کچھ دیر کے لئے تفریح تفنگ سے باز آجائیں تو بہتر ہے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ ان حضرات نے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم لوگ سڑک سے گذرنا چاہتے ہیں جنگ کو ملتوی کر دیا اور ہمارا موٹر روانہ ہوا۔

یہ حصّہ اس زمانے میں "ٹرائبل ایریا" کہا جاتا تھا۔ اس کے باشندے نہ اپنے آپ کو کابل کی رعایا خیال کرتے اور نہ برٹش حکومت کی۔ یہ آزاد لوگ تھے اور اب بھی شاید اسی حالت میں ہوں یہ اپنے روزانہ کے جھگڑے اپنی پنچایتوں میں طے کر لیتے تھے۔ اور اگر کوئی بڑا قضیہ ہو تو "جرگا" جمع ہو کر طے کرتا تھا۔ برٹش حکومت نے ان کے مختلف سرداروں سے مل کر یہ طے کر لیا تھا کہ درّہ خیبر

کی سڑک کی حفاظت کے یہ لوگ ذمہ دار ہوں۔ اس ذمہ داری کے عوض انھیں خاصی رقومات کسی نہ
کسی نام سے دی جاتی تھیں۔ مثلاً انھیں لوگوں میں ایک بے قاعدہ فوج حفاظت شاہراہ کے واسطے
بنائی تھی۔ ان کو جہاں تک مجھے یاد ہے خاصہ دار کہتے تھے۔ یہ لوگ اپنی رائفل اور کارتوس خود تیار
کرتے ہیں۔ جب ہم درۂ خیبر سے گذر رہے تھے تو یہ لوگ جابجا حفاظت کی غرض سے سڑک پر کھڑے
ہوئے تھے۔ سرراہ ایسی چوٹیوں یا موڑوں پر جہاں سے سڑک پر رائفل سے نشانہ لگایا جاسکتا ہو یہ
لوگ موجود تھے۔

اس سرزمین میں زراعت برائے نام ہی تھی۔ چٹیل پہاڑ جن پر درخت یا سبزہ کا نام و نشان نہیں
بارش بہت کم ہوتی ہے۔ کسی قسم کی صنعت و تجارت نہیں۔ پھر ایسے ملک کے باشی اگر لوٹ مار نہ کریں تو
کیا کھائیں۔ جب تک ان لوگوں کے واسطے کسب معاش کا انتظام نہ ہوگا اس خطۂ زمین پر صحیح معنوں
میں امن قائم نہ ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ اکثر سڑک کے قریب گاؤں آباد ہیں۔ ہر گاؤں میں چہار دیواری
ہوتی ہے۔ ہر کونے پر ایک ٹاور بنا ہوتا ہے۔ جہاں سے رائفل آسانی سے چلائے جاسکتے ہیں۔ گویا ہر
گاؤں ایک چھوٹا سا قلعہ ہوتا ہے۔ گاؤں سے لے کر سڑک تک ایک خندق ہوتی ہے جس کا منشا یہ ہے
کہ اگر دوسرے گاؤں سے لڑائی ہو رہی ہو لیکن کسی غرض سے باہر جانا ضروری ہے تو اسی خندق کے
ذریعہ سڑک پر آجائیں۔ چونکہ سڑک کی ذمہ داری انھیں لوگوں پر ہے لہذا سڑک پر جائے امن قائم
کر دی گئی تھی۔ اور اگر کوئی واقعہ سڑک پر ہو جاتا تھا تو برٹش حکومت باز پرس کرتی تھی۔ میں درہ کے
آخری حصہ میں اترا وہاں چند خاصہ دار اپنے رائفل اور کارتوسوں کی پیٹی سے سج کھڑے تھے۔
چونکہ چیف کمشنر مجھے بتا چکے تھے کہ اپنے کارتوس اور رائفل خود بناتے ہیں۔ میں نے ایک خاصہ دار
کے سینہ کی پیٹی پر کارتوس کو چھو کر دیکھا۔ اسی کے ساتھ میری نظر چیف کمشنر کے چہرے پر پڑی تو میں
نے دریافت کیا تو چیف کمشنر نے کہا کہ چند سال قبل کسی انگریز افسر نے اسی طرح کسی خاصہ دار کی
رائفل یا کارتوس کو چھو کر دیکھا۔ اسی کے ساتھ میری نظر چیف کمشنر کے چہرے پر پڑی تو میں نے کچھ پریشانی
کے آثار پائے میں کچھ سمجھا۔ لیکن واپسی پر میں نے دریافت کیا تو چیف کمشنر نے کہا کہ چند سال قبل

کسی انگریز افسر نے اسی طرح کسی خاصہ دار کی رائفل یا کارتوس چھو کر دیکھے۔ خاصہ دار نے چند قدم ہٹ کر اس افسر کو اپنے رائفل کا نشانہ بنا دیا۔ میں اسی شب وہاں سے روانہ ہو کر کچھ دیر لاہور سر سکندر مرحوم کے پاس ٹھہرتا ہوا ۱۴ ؍ ۲ کو دہلی پہنچا۔

حضور نظام

انہی دنوں حضور نظام حیدرآباد سے دہلی آئے تھے۔ ان کے ساتھ دونوں ترک شہزادیاں پرنسس دُرِّ شاہوار اور پرنسس نیلوفر بھی تھیں۔ ولی عہد پرنس اعظم جاہ کی شادی شاہزادی دُرِّ شاہوار سے اور صاحبزادہ معظم جاہ کی شادی شہزادی نیلوفر سے ہوئی تھی۔ ان شہزادیوں کی حسن و خوبی کا دہلی کی سوسائٹی میں بڑا شہرہ تھا۔ لارڈ ولنگڈن نے ایک "ایٹ ہوم" بڑے پیمانے پر کیا۔ ڈنر کے بعد یہ جلسہ تھا۔ مجھے اس موقع پر پہلی بار شہزادی درشہوار سے شرفِ تعارف حاصل ہوا۔ شہزادی صاحبہ نے مجھ سے کہا کہ وہ اس زمانہ ایک فرنچ ناول کا ترجمہ کر رہی تھیں یا فرنچ زبان میں ترجمہ کر رہی تھیں۔ دہلی کے حلقوں میں اس رشتۂ عروسی کو حیدرآباد کے واسطے فالِ نیک تصور کیا گیا۔ شہزادی دُرِّ شہوار آخری بادشاہ ٹرکی سلطان عبدالحمید خاں کی بیٹی ہیں۔ اور دوسری شاہزادی شاہد سلطان کی بھتیجی ہیں۔ حضور نظام سے بھی ملاقات ہوئی۔

یو۔پی کو واپسی

اب سر فضل حسین کی واپسی کا زمانہ قریب تھا۔ میں ۲۸ فروری کی شام کو دہلی سے چل کر لکھنؤ پہنچا۔

تنخواہ میں کمی

انگلستان میں ایک روز میرے ذہن میں یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ برطانیہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ پانچ ہزار پونڈ سالانہ ہوتی ہے۔ میری تنخواہ بحیثیت ہوم ممبر کے پینسٹھ ہزار روپیہ سالانہ تھی جو وزیر اعظم کی تنخواہ سے

کچھ ہی کم تھی۔ کام اور ذمہ داری کا مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہے میرے کام کو وزیر اعظم برطانیہ کے کام اور
ذمہ داریوں سے کوئی نسبت نہیں دی جا سکتی تھی۔ یہاں واپس آیا تو دیکھا کہ تمام ملک کی اقتصادی حالت
خراب تھی اور یو۔پی کا حال خاص طور پر ابتر تھا۔ میں نے خیال کیا کہ اس موقع پر اگر میں اپنی تنخواہ میں خود
کمی کر دوں تو ممکن ہے دوسرے بھی اس کی پیروی کریں۔ اور اس طرح صوبہ کی مالی حالت کو فائدہ پہنچے
مگر یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ میں نے اپنی تنخواہ بجائے پینسٹھ ہزار سالانہ کے اڑتالیس ہزار سالانہ رکھی اور محکمہ
فنانس کو مطلع کر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ خود مجھے اس تخفیف کرنے سے کچھ قلبی آرام ہی محسوس ہوا اور وہ خلش جو وزیر اعظم
برطانیہ کی تنخواہ اور اپنی تنخواہ کے تقابل سے پیدا ہوئی تھی جاتی رہی۔

وزراء اور دوسرے ذمہ دار ملازمین کی تنخواہوں کے متعلق اکثر حضرات اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ بعض
لوگ کبھی جمہوریت، کبھی آزادی، کبھی محبت ملک و قوم کے نام سے اس پر زور دیتے ہیں کہ تنخواہیں کم کی جائیں
میرے خیال میں یہ مسائل مالی ہیں۔ اور مالی ہی نظر سے انھیں دیکھنا چاہیئے۔ اقتصادی معاملات کو اقتصادی
نظر سے دیکھئے اور نتیجہ نکالئے پھر اس نتیجہ کو سیاسی روشنی میں پرکھئے اور چونکہ ووٹوں کو حاصل کرنا بھی ایک
سیاسی جماعت کی اہم ضرورت ہے اس لئے ضرورت ہو تو اس میں مناسب ترمیم کر لیجئے لیکن اقتصادی
معاملات کو سیاسیات کا بازیچۂ اطفال بنانے کے میں سخت خلاف ہوں۔

ہر ملازم کو اس قدر تنخواہ ضرور ملنی چاہیئے کہ وہ اپنا اور اپنے متعلقین کے کھانے کپڑے تعلیم اور
علاج معالجہ کے اخراجات برداشت کر سکے۔ اس عام اصول کے ساتھ اس کا بھی خیال ضروری ہے کہ جس حیثیت
اور پوزیشن کی ملازمت ہے اس معیار زندگی کو وہ قائم رکھ سکے۔ ذمہ دار اور اہم خدمات کے لئے ہمیں ملک
کے بہترین افراد درکار ہوتے ہیں۔ اگر تنخواہ کم ہوگی تو ایک غریب لیکن ہر طرح موزوں شخص کی خدمات سے ہم
مستفید نہ ہو سکیں گے۔ وہ انکار کرے گا یا پھر ایسے میدان میں قدم رکھے گا۔ جہاں بڑے بڑوں کے پاؤں
ڈگمگا جاتے ہیں۔ وزراء کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ انھیں ایک خاص معیار زندگی رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے
ان کی تنخواہوں کو مہمل حد تک گھٹانا کوئی معنی نہیں رکھتا یہ سیاسی بازیگری ہے۔ صوبوں کے وزراء کی تنخواہیں

ہزار اور مرکزی حکومت میں چار یا ساڑھے چار ہزار تنخواہ مناسب ہے۔

ہیں مناسب تنخواہ کی موافقت میں ہوں۔ پھر دوسری رعائتیں نہ ہونی چاہئیں۔ ایسی رعائتیں اصولاً درست نہیں۔ ان رعایتوں کو ایک طرف روا رکھنا اور دوسری طرف تنخواہ کو کم دکھانا سٹے بازی ہے۔ پھر اس میں یہ خرابی ہے کہ ایسا طریقہ کار کفایت شعاری کے بجائے فضول خرچی کا محرک ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب جتنی بجلی خرچ کرتے ہیں۔ اگر اس کا ماہانہ بل وہ خود ادا کرتے ہیں تو وہ کوشش کریں گے کہ گھر میں کم از کم بجلی صرف ہو۔ لیکن جن کو مفت بھی دی گئی ہو وہ ہر شب چراغاں کریں یا شب و روز پنکھے چلتے رہیں تو کیا مضائقہ!

اسی طرح اگر پٹرول مفت ہے تو جن صاحب کو یہ حق حاصل ہے ان کا موٹر بھانڈوں کی پالکی بن جائے گا تھوڑی تھوڑی ضرورتوں کے واسطے موٹر دوڑایا جائے گا۔ لیکن پٹرول کے دام اگر انھیں خود ادا کرنے پڑیں تو پھر پٹرول کا ماہانہ بل خود کفایت شعاری سکھانے کے واسطے کافی ہے۔

اس قسم کی رعایت سوائے پریسیڈنٹ اور گورنر کے اور کسی کے لئے نہیں ہونی چاہئیں۔

۲۹ر فروری کو فنانس ممبر نے کونسل میں اعلان کیا کہ میں نے اپنی تنخواہ پانچ ہزار تین سو تیس کے بجائے چار ہزار روپیہ ماہوار لینا طے کیا ہے۔ فنانس ممبر نے مناسب الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا۔

دہلی سے واپس ہوتے ہوئے حضور نظام لکھنؤ تشریف لائے۔ اسپیشل ہی میں قیام رہا۔ ترکی شہزادیاں تو ہمراہ نہ تھیں باقی صاحبزادگان اور صاحبزادیاں لکھنؤ تشریف لائیں۔ نواب زین یار جنگ ہمراہ تھے۔ نواب صاحب حضور نظام کے خاص مقربین میں سے ہیں۔ یہ ایک انجینئر کی حیثیت سے ملازم ہوئے تھے۔ محلات خاص کی ڈویژن میں تبادلہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر ان کی خدمات نظام کو اتنی پسند آئیں کہ اپنے سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ حکمران کے پرسنل اسٹاف میں کام کرنے لگے۔ یہی ان کی ترقی کا پہلا زینہ تھا۔ ان کے متعلق مفصل تو شاید آئندہ کہنے کا موقع آئے۔ یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ بڑے عقیل۔ ذہین اور معاملہ فہم شخص ہیں اپنے حاکم کے بڑے مزاج داں ہیں۔ زمانہ شناسی ان کا خاص جوہر ہے۔

میں نے صغیر احمد عباسی صاحب کو ان کے پاس بھیجا کہ میری طرف سے نواب صاحب حضور نظام سے ایک ایٹ ہوم کی اجازت لیں۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے ڈنر کی دعوت قبول فرمائی۔ میں نے ایٹ ہوم کی خواہش اس وجہ

سے کی تھی کہ ڈونر میں ظاہر ہے۔ اتنے مہمان نہیں بلائے جا سکتے۔ حضور نظام کا ڈونر مہاراجہ جہانگیر آباد سر اعجاز رسول مرحوم اور راجہ سعادت علی خاں تعلقدار نان پارہ کے ہاں پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ تیسرا میرے ہاں۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی تقریر میں میرے اوپر کرم خاص کا اظہار فرمایا اور "بھائی" کے لفظ سے میرا ذکر فرمایا۔

شکار

اسی سال سید اعجاز علی صاحب نے جو بجنور میں کلکٹر تھے سر جگدیش پرشاد کو شکار کی دعوت دی سر جگدیش پرشاد نے مجھے مدعو کیا اور دو روز کے واسطے میں بھی شریک شکار ہوا۔

گو مجھے شکار کا شوق بچپن سے ہی ہے۔ میرا سارا خاندان شکار کا شوقین ہے۔ دادا صاحب غفران مآب باوجود پیرانہ سالی کے میری یاد میں گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کو جایا کرتے تھے۔ لیکن شیر کے شکار کا موقع اس سے قبل نہیں ملا تھا۔

شکار کے پرانے طریقے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ قسم قسم کے آلات کی ایجاد، معاشی زبوں حالی، معاشرہ کے نئے طور طریقے اور بعض امور اس کا باعث ہیں۔ مجھے یاد ہے ہرن کے شکار کی غرض سے چیتے پالے جاتے تھے۔ ہماری ریاست میں تو کوئی چیتا میرے زمانے میں نہیں رہا تھا۔ لیکن راجہ صاحب مرسان کے چیتے میں نے دیکھے تھے۔ ان کی آنکھوں پر چمڑے کی ٹوپی ہوتی تھی۔ تانگوں پر بیٹھ کر شکار کو جاتے تھے۔ یہ بہت خوبصورت جانور ہوتا ہے۔ نہایت سڈول جسم دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جانور کس لئے پیدا کیا گیا۔ مجھے چیتے کے شکار دیکھنے کا موقع نہیں ہوا۔

مجھے کتوں کے شکار بھی شوق تھا۔ میرے پاس تازی اور گرے ہاؤنڈ کتے تھے۔ اس زمانے میں کتوں کے شکار کا شوق عام تھا۔ خرگوش اور کتے کی رفتار کا اندازہ امتحان کے سوالات سے بھی ہوتا ہے جس سے ہر شخص کو طالب علمی میں سابقہ رہا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ پُرلطف لومڑی کا شکار ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تیس تیس اور چالیس چالیس منٹ کی کوشش کے بعد بھی لومڑی ہاتھ نہ آئی اور کتے تھک کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے

گھوڑے پر سوار ہو کر اس دوڑ میں شرکت کی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ لومڑی کی دم قد کے لحاظ سے طویل اور بالوں
کی وجہ سے تقریباً اس کے جسم کے برابر موٹی معلوم ہوتی ہے۔ ناتجربہ کار کتا اس بالوں کے گچھے کو پکڑنا چاہتا ہے
لومڑی اگر اپنی دُم کو داہنی جانب کو جھٹکا دے گی تو کتے کا رُخ اس طرف ہو جاتا ہے اور یہ بہت تیزی سے
سمت مخالف میں مُڑ جاتی ہے۔ اسی طرح کتے اور لومڑی کے درمیان پھر فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ یہی بار بار
ہوتا رہتا ہے۔

مجھے اپنی عمر میں ایک کتے اور ایک گھوڑے سے کچھ ایسا سابقہ ہوا۔ جو مجھے تمام عمر یاد رہے گا۔ اس
کتے کا نام موتی تھا۔ اسے میرے ساتھ بہت تعلق تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس میں رشک یا حسد کے جذبات
تھے۔ جب شکار میں میرے ساتھ اور کتے ہوتے تو موتی صرف میرے ساتھ رہتا مگر شکار نہیں کھیلتا تھا
لیکن جب تنہا میرے ساتھ ہوتا تو خوب شکار کھیلتا تھا۔ بڑا طاقتور اور تیز دوڑنے والا کتا تھا۔ دو بار برسات کے
زمانے میں اس نے ہرن کے بچے بھی مارے۔ یہ بہت اچھا محافظ تھا۔ جب تک میں جاگتا رہتا یہ پلنگ کے
نیچے آنکھیں بند کئے پڑا رہتا۔ لیکن میرے سونے کے بعد پلنگ کے نزدیک میرے ملازم تک نہیں جا سکتے تھے
میں نے جس گھوڑے کا ذکر کیا اس کا نام "منصور" تھا۔ یہ عرب تھا۔ بڑا خوبصورت۔ مجھ سے بہت مانوس
تھا۔ چھتاری میں اصطبل بالکل ہماری گڑھی کے نیچے ہے۔ جب کبھی اسے فصیل سے کھڑے ہو کر آواز دیتا تو یہ
جواب میں بولتا۔ تیتر کے شکار میں اکثر یہ ہوتا کہ میں اس پر سے اُتر کر بندوق لے کر چل دیتا۔ مگر یہ بغیر سائیس
کے میرے ساتھ پھرتا رہتا۔ عرب گھوڑے کبھی کبھی جب زیادہ عرصہ سے ورزش نہ ہوئی ہو تو پاشنو بھاگتے
ہوئے طرارہ لیتے ہیں۔ یہ بھی اکثر طرارہ لیتا تھا۔ لیکن جب کبھی مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ میں گر جاؤں گا تو میں نے اس کی
گردن پر ہاتھ مار کر بس کہا اور یہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ اور جب تک میں اچھی طرح سنبھل کر پھر اشارہ نہ کر دوں
اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا۔ مجھے اس گھوڑے سے بڑی الفت تھی۔ میں اسے اکثر موسم گرما میں نینی تال لے جاتا
تھا اور گھر پر بھی اس کے تھان کو ٹھنڈا رکھنے کا اہتمام ہوتا تھا۔

مجھے شکاری پرندوں کی مدد سے شکار کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ چھتاری میں اس زمانے میں دو بازدار
تھے۔ ایک بازخانے کے بازدار محمود خاں مرحوم تھے اور دوسرے کے علی احمد مرحوم

ان شکاری جانوروں کی یوں تو بہت اقسام ہیں لیکن دو خاص بڑی قسمیں ہیں۔ (۱) "سیاہ چشم"
اور (۲) "گلال چشم"

سیاہ چشم وہ ہیں جن کی تمام آنکھ سیاہ ہوتی ہے۔ ان میں بحری۔ شاہین۔ ترمتی۔ لگڑ اور بہت سی
دوسری اقسام ہیں۔ لیکن بحری اس میں سب سے زیادہ طاقتور، بہادر اور تیز پرواز ہوتی ہے۔ علی احمد مرحوم
سیاہ چشم جانوروں کے سکھانے اور تربیت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی بحری اور شاہین بہت اچھی ہوتی تھیں
علی احمد کی بحری نے ایک بار میرے سامنے علی گڑھ میں "چندنوکا" مارا یہ کسی طرح کلنگ سے کم نہیں ہوتا اور
اس کی چونچ تو والو یا آلہ دھاردار کے تحت آسکتی ہے۔ مجھے بحری۔ بحری بچہ (بحری کا نر) اور شاہین کا
شکار بہت پسند تھا۔ بحری کا عموماً بزہ اور کبوتر شکار ہوتا ہے۔ کبوتر بہت بچاتا ہے۔ بحری بچہ اور شاہین
سے ٹیڑھی کا شکار بہت پُرلطف ہوتا ہے۔ ٹیڑھی بہت بچاتی ہے۔ بعض اوقات میلوں بچاتی چلی جاتی ہے
جب شاہین اسے پکڑنا چاہتی ہے۔ یہ ہوا میں پتنے کی طرح پلٹ جاتی ہے اور شاہین رفتار کے زور میں
آٹھ دس گز ہوا میں اوپر کی جانب نکل جاتی ہے۔ پھر اوپر سے سمیٹ کر حملہ آور ہوتی ہے اور ٹیڑھی پھر اس
طرح بچاتی ہے۔ ترمتی کا نیل کنٹھ کے شکار میں لطف ہوتا ہے۔ نیل کنٹھ بھی غضب کا بچاتا ہے۔ سیاہ چشم
جانوروں کا شکار بغیر گھوڑے کی سواری کے بے لطف ہے۔ میلوں گھوڑا دوڑانا پڑتا ہے اور کبھی کبھی
حادثے بھی ہو جاتے ہیں۔ اس واسطے کہ سوار کی نظریں تو آسمان کی طرف ہوتی ہیں اور گھوڑا دوڑتا
ہوتا ہے۔

دوسرا بازخانہ محمود خاں مرحوم سے تعلق تھا۔ یہ "گلال چشم" شکاری جانوروں کو سکھانے کے
بڑے استاد تھے۔ گلال چشم جانوروں میں باز سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ جرا اس کا نر ہوتا ہے۔ جملہ
شکاری پرندوں میں مادین نر سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ 'جرا' باز سے بہت چھوٹا اور کمزور
ہوتا ہے۔ گلال چشم جانوروں میں ہمارے ہاں باز تو ایک سے زیادہ یاد نہیں شاید بازخانہ کی شان
کے لئے ایک باز رہتا تھا لیکن جرے تین چار ضرور ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ "باشے" بھی بڑے شوق سے
پالے جاتے تھے۔ باز کا شکار مور۔ خرگوش۔ چیل۔ کبوتر۔ قاز۔ سرخاب۔ یہ سب جانور ہیں۔ جرے کا

شکار تیتر۔ مرغابی۔ کوا۔ بگلا ہیں۔ گلال چشم جانور ہاتھ سے اترتے ہی تیزی سے جھپٹتے ہیں۔ لیکن اگر جانور ہاتھ نہ آیا تو بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی جھپٹ سو دو سو گز بلا کی تیز ہوتی ہے۔ البتہ تیتر اور مور کا یہ پیچھا کرتے ہیں۔ انھیں اس کا احساس ہے کہ یہ جانور دور تک نہیں جا سکتے۔ ان کے شکار میں گھوڑا ضروری نہیں۔ ان جانوروں میں باشہ سب سے زیادہ خوبصورت۔ نازک اور تیز رفتار ہوتا ہے۔ تیتر بٹیر بہت لطف سے مارتا ہے۔ یہ تمام جانور پہاڑی ہیں۔ "شکرا" غریب ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ اس کی پرواز زیادہ تیز نہیں ہوتی اس لئے اسے مٹھی میں بھر کر قریب سے جانور کی طرف پھینکتے ہیں۔ یہ بہت چھوٹا لیکن بہت بہادر جانور ہے اپنے قد سے کہیں بڑے جانوروں کو پکڑ لیتا ہے۔

مجھے بندوق سے شکار کا بھی شوق ہے۔ کسی زمانے میں خاصی بندوق چلا لیتا تھا۔ اب تو شوق ہی شوق رہ گیا ہے۔ مجھے پرندے کے شکار کا زیادہ شوق ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں جتنے پرند ہیں ان میں مرغابی کا مارنا بشرطیکہ تنہا آرہی ہو مشکل ہے۔ اگر کارتوس گن کر فی صدی اوسط نکالا جائے تو تیتر بٹیر یہاں تک کہ اسنائپ کے مقابلہ میں بھی مرغابی کا اوسط سب سے کم ہوتا ہے۔ تیتر کا مارنا سب سے آسان ہے بشرطیکہ بندوق جھاڑنے والوں کے ساتھ ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے۔ جب جنگل کی جھاڑیاں یا کھیت انسانی قد سے زیادہ بلند نہ ہوں۔ لیکن اگر بندوقیں آگے لگا دی جائیں اور جھاڑنے والے تیتروں کو اڑائیں تب نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ بٹیر کا مارنا بھی چنداں دشوار نہیں ہوتا۔ میں ساٹھ ستر فی صدی مار لیتا تھا۔ ایک بار ۱۹۳۲ء میں دہرہ دون کے کھیتوں میں بٹیر کا شکار ہوا۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ دستور یہ تھا کہ جب گورنر لکھنؤ سے نینی تال کا قصد کرتے تو کم و بیش ایک ہفتہ کے واسطے دہرہ دون چلے جاتے تاکہ ملازمین کو نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس میں سامان لگانے اور آسائش کا انتظام کرنے کا وقت ملے۔ اسی سلسلے میں دہرہ دون قیام رہتا۔ میں نے بٹیر کا شکار اس سے بہتر بغیر "بلاوے" کے کہیں نہیں دیکھا۔ راحت فرحت بھی میرے ساتھ تھے۔ گیہوں کے کھیتوں میں بٹیر تھے۔ مارنا آسان تھا۔ جہاں بٹیر اڑ کر گیہوں کی بالوں سے نکلا، بندوق چلی اور وہیں گر گیا۔ اس شکار میں پہلے سولہ فائروں میں سولہ بٹیر گرے۔ ایک بھی خالی نہیں گیا۔ یہ میری عمر میں ریکارڈ تھا۔ لیکن اسی شکار میں راحت کی اکثر بندوقیں خالی جا رہی تھیں۔ ان کی بندوق وزنی تھی۔

میں نے اپنی بندوق انھیں دیدی اور خود ان کی بندوق لے لی۔ میرا اوسط تین فائروں میں دو بٹیریں رہ گیا دوران شکار میں بندوق نہیں بدلنی چاہیئے۔ یا پھر دونوں بندوقیں جوڑا بنائی گئی ہوں۔ اس شام کا ہمارا کل شکار ۹۴ بٹیر تھے۔

خان صاحب جعفر خاں میرے واسطے "بلارے" بٹیر پالا کرتے تھے۔ بیس بٹیروں کی ایک "جھڑ" کہلاتی ہے۔ یہ سب نر بٹیر ہوتے ہیں۔ تنہا ایک بٹیر ایک پنجرے میں ہوتا ہے۔ شب کے وقت انھیں کھیت میں لگایا جاتا ہے۔ انھیں طاقتور غذائیں مثل بادام وغیرہ دی جاتی ہیں۔ شب کی ٹھنڈی ہوا میں یہ بولنا شروع کرتے ہیں۔ چال کے بٹیر جو شب کے وقت اس طرف سے گذر رہے ہوں ان کی آواز سن کر اس کھیت میں جوق درجوق اتر آتے ہیں۔ صبح کو جال سے پکڑ لیا جاتا ہے یا بندوق سے شکار ہوتا ہے۔ میں اکثر دوستوں کو بلا کر شکار کھیلا کرتا تھا۔ بندوق کا شکار چار بجے شام سے شروع ہوتا اور غروب آفتاب تک سو ڈیڑھ سو بٹیر شکار ہو جاتے تھے۔ یہ شکار بہت پُر لطف ہوتا ہے۔

اسنائپ (ایک قسم کا چہا) کا مارنا تیتر بٹیر سے مشکل ہے۔ اول تو اس کی پرواز بہت تیز ہوتی ہے۔ دوسرے یہ بہت کم سیدھا اڑتا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹرتا ٹرتا ہوا اٹھتا ہے۔ اس لئے اکثر فائر خالی جاتے ہیں۔ پھر ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ شکاری خود پانی میں چلتا ہوتا ہے

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس وقت اسنائپ اٹھا۔ شکاری کا پاؤں کیچڑ کی وجہ سے پھسلا۔ لغزش پا کی وجہ سے بندوق بہک جاتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یکایک کسی طرف اسنائپ اٹھا۔ جس کی آواز پر شکاری نے پلٹنا چاہا مگر کیچڑ اور پانی سے پاؤں پھسلا یا زیر آب گھاس میں الجھا اور شکاری کا توازن جسمانی بگڑ گیا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ نہ ہو وہ کم ہے۔ شکاری خود ڈبکی کھا جاتا ہے۔ اسنائپ کا مارنا نو آموز شکاریوں کو بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ بندوق تیزی سے چلانی پڑتی ہے۔ میرا اوسط اسنائپ کے شکار میں تقریباً پچاس فی صدی ہے۔ صرف ایک بار "پلاکستری" کے جھیل پر میں نے تیرہ فائر کئے اور گیارہ اسنائپ مارے۔ لیکن اس کے اسباب خاص تھے۔ فروری کا مہینہ تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ بڑی بڑی خشک گھاس میں اسنائپ سایہ کی وجہ سے بیٹھا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے زمین خشک تھی۔ پھسلنے کا اندیشہ نہ تھا۔ دھوپ کی تیزی سے اسنائپ بالکل

ہی قریب پہنچ جانے پر اٹھتا تھا۔ ان وجہ سے یہ اوسط رہا۔

مرغابی کا شکار اس طرح تو آسان ہے کہ غول پر بندوق چلی اور تین چار اتفاق سے گر گئیں۔ لیکن تنہا مرغابی کا مارنا آسان نہیں ہے۔ مرغابی کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان سب کی رفتار یکساں نہیں۔ مثلاً "ٹیل" یا سیخ پر بہت تیز پرواز ہیں۔ "نیل سر" "لال سر" کی پرواز اتنی تیز نہیں ہوتی۔ پہلی دشواری یہ ہوتی ہے کہ ہر مرغابی کی رفتار سے بندوق کو پرندے سے کچھ آگے چلانا پڑتا ہے۔ اس میں اکثر غلطی ہوتی ہے۔ دوسرے مرغابی طاقتور پرندہ ہے اگر کاری چوٹ نہیں لگی تو باوجود زخمی ہونے کے اڑتی چلی جاتی ہے۔ تیسرے اکثر مرغابی فاصلہ سے گذرتی ہے اور جب تک چھرہ اس تک پہنچے وہ اپنی رفتار کی وجہ سے کچھ آگے نکل چکی ہوتی ہے۔ اکثر شکاریوں کی یہ رائے ہے جس سے مجھے اتفاق ہے کہ اگر مرغابی چالیس گز کے فاصلہ سے گذر رہی ہے اور اس کی رفتار چالیس میل فی گھنٹہ ہے تو ایک فٹ بندوق آگے چلانی چاہیئے۔ بعض کا خیال ہے کہ مرغابی کے ساتھ بندوق بھی حرکت میں رہے تو آسانی ہوتی ہے۔ یعنی بندوق روک کر فائر نہ کرے۔ مرغابی کے ساتھ ہاتھ گھومتا چلا جائے۔ بہرحال میرا مرغابی کا اوسط ۳۵ فی صدی کے لگ بھگ رہتا ہے۔ چکور کے شکار کا ۱۹۵۳ء میں مجھے پہلا موقع ملا۔

ہندوستانی ہونے کے باوجود میں اب تک ایشیا کے خوبصورت ترین ملک خطّہ کشمیر نہیں گیا تھا۔ ایک روز اپنے مخلص کرم فرما مسٹر وشنو سہائے آئی۔ سی۔ ایس سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے گھر کھانے پر تھا۔ جہاں شیخ عبداللہ صاحب وزیر اعظم کشمیر بھی تھے۔ وزیر اعظم صاحب نے اپنے کرم سے دعوت دی۔ وشنو سہائے صاحب نے برادرانہ محبت سے ترغیب دی۔ یوں کشمیر جانا ہوا۔ وہاں میری خواہش پر شیخ صاحب نے چکور کے شکار کا انتظام فرمایا۔ اس طرح یہ آرزو پوری ہوئی۔

چکور کے شکار کے واسطے بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے لوگ پہاڑ کے جنگل کو جھاڑتے ہیں۔ شکاری پہلے سے چکور کی گذرگاہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چکور کے اڑتے ہی جھاڑنے والے سیٹی زور سے بجاتے ہیں تاکہ شکاری تیار ہو جائیں۔ چنانچہ میں بیٹھا تھا کہ سیٹی کی آواز آئی اور کچھ سکنڈ کے بعد ایک چکور اتنی تیزی سے نکل گیا کہ مجھے بندوق اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ چلانا تو درکنار۔ پھر اس کے بعد اور چکور آئے لیکن کئی فائر

برابر خالی گئے۔ آخر کار ایک چکور میں نے مارا۔ اس کے بعد دوسرے پہاڑ پہ پانچ مارے اور تیسرے پہاڑ کے ہانکے پر دس مارے۔ مجھے اس سے اندازہ ہوا کہ میری آنکھ اور ہاتھ چکور کی پرواز کا عادی ہوتا جاتا تھا۔

نئے شکاری کو چکور کے شکار میں پہلی دقت تو یہ ہوتی ہے کہ ہماری آنکھ اس کی عادی ہے کہ اڑتے جانور کو افق کے پس منظر میں دیکھیں۔ چونکہ پس منظر میں سوائے آسمان کے کچھ نہیں ہوتا تو جانور پرواز کی حالت میں صاف نظر آتا ہے۔ پہاڑوں میں چکور کوہسار سے ملا ہوا اڑتا ہے اور خود بڑی حد تک پتھروں کے ہمرنگ ہوتا ہے۔ لہذا جب تک قریب ہی نہ آجائے نظر نہیں آتا۔ دوسرے چونکہ اس کا رخ پہاڑ سے اکثر نیچے کی طرف ہوتا ہے رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ شکار بہت پُرلطف ہے۔

مجھے بڑے جانوروں کے شکار کا کچھ زیادہ شوق نہیں۔ رائفل نوعمری کے زمانے میں چلانے کا شوق تھا۔ میں بھاگتے جانوروں پر نشانہ لگا لیتا تھا۔ بہت سے کارتوس ضائع کرنے کے بعد میں نے دو بار اڑتے کبوتر بھی گولی سے مارے۔ مگر یہ نشانہ نہیں۔ صرف اتفاق ہے۔ ہرن کا شکار تو ایک واقعہ کی وجہ سے ترک ہی ہوگیا۔ ایک بار میں مرغابی کے شکار کی غرض سے "پلاکستری" کے جھیل کو جا رہا تھا۔ اس زمانہ میں موٹروں کا نہ اتنا رواج تھا اور نہ اس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک پختہ سڑک تھی میں گاڑی جوڑی میں گیا اور کچے راستہ میں بیلوں کے تانگہ میں جا رہا تھا۔ اس راستہ میں ایک زبردست میدان پڑتا ہے۔ تین ہرنیاں اور ایک کالا ہمارے تانگہ کے سامنے سے گذرے۔ میں نے اتر کر زمین پر بیٹھ کر گولی چلائی۔ کالا ہرن گرا۔ میں رائفل ہاتھ میں لئے ہوئے اس کی طرف بھاگا۔ جب قریب پہنچا تو ہرن نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں کیا کہوں ان خاموش آنکھوں نے مجھ سے کیا کہا۔ ان میں مجھے خوف سے زیادہ ملامت محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ میرا ذہن کلام پاک کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا (باےّ ذنبٍ قتلت) مجھے کس گناہ پر تم نے قتل کیا ہے۔ میں بے حد نادم تھا۔ تلافی ناممکن تھی۔ ہرن کے چوٹ کاری لگی تھی اس کا بچنا محال تھا۔ میں نے اپنا رخ تانگہ کی طرف کیا۔ مگر دل میں عہد واثق کر لیا کہ اب کبھی ہرن پر بندوق نہ چلاؤں گا۔

میں نے بجنور کے جس شکار کا ذکر شروع کیا تھا وہ پہلا شکار تھا۔ شیروں کی گزرگاہوں پر کٹڑے باندھے گئے تھے مگر صبح کو معلوم ہوا کہ کوئی کٹڑہ شیر نے نہیں مارا۔ لنچ کے بعد ہم لوگ ہاتھیوں پر سوار ہو کر جنگل میں گھومنے نکلے۔ عصر کے وقت تک پھرتے رہے۔ کوئی جانور نظر نہ آیا۔ واپسی کے وقت برابر کے جنگل سے چیتل کے بولنے کی آواز آئی۔ چیتل جب شیر یا گلدار کو دیکھتی ہے تو جنگل کے جانوروں کو متنبہ کرنے کے واسطے ایک خاص آواز دیتی ہے۔ اسی طرح سامر۔ کاکڑا اور بندر بھی شیر یا گلدار کو دیکھ کر آواز دیتے ہیں۔ ہم نے ہاتھیوں کو اس طرف بڑھایا۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ ایک گلدار سور کے چند بچوں کی تاک میں گھوم رہا ہے۔ لیکن بڑے سور اسے حملہ کا موقع نہیں دیتے تھے۔ چیتل اسے دیکھ کر بول رہی تھیں ہمارے آنے پر گلدار برابر کے گھاس کے جنگل میں چلا گیا۔ ہم نے اپنے ہاتھی اسی طرف کو بڑھا دئے۔ آفتاب غروب ہوچکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھی سے کوئی اسی گز پر گلدار جا رہا ہے۔ میں نے گولی چلائی وہ تیزی سے بھاگا۔ میرے ہاتھی پر میرے ساتھ عالمگیر خاں صاحب بیٹھے تھے۔ ان کی گولی چلی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی گولی لگی اور چند گز دوڑ کر گر گیا۔ لیکن میرے میزبان سید اعجاز علی صاحب اور مسٹر جگدیش پرشاد صاحب کی عنایت نے اسے میرے ہی نامہ اعمال میں لکھا دیا۔

سید اعجاز علی

سید اعجاز علی صاحب پروونشل سروس کے ایک ممتاز رکن تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت۔ دیانت۔ سوجھ بوجھ گورنمنٹ میں مسلمہ تھی۔ جہاں رہے ہر دلعزیز رہے۔ کلکٹری سے پنشن پائی۔ اس کے بعد ریاست رامپور کے دیوان ہو کر چلے گئے۔ بڑی خوبیوں کی ذات ہے۔ ان میں پرانی اور نئی تہذیب کی بہترین صفات موجود ہیں۔

دوسرے روز صبح کو پھر یہی اطلاع ملی کہ شیر نے کوئی کٹڑا نہیں مارا۔ کچھ مایوسی ہوئی لیکن گھومنے کو صبح ہی چل دئے۔ راستے میں شیر کے پاؤں کے تازہ نشانات ملے جو ایک گھاس کے جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ ہاتھیوں کا رُخ اسی جانب کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھی سے تقریباً سو گز

کے فاصلہ پر ایک شیر جا رہا ہے۔ وہ رُکا اور مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے گولی چلائی اور اس کے ایک سکنڈ کے بعد عالمگیر خاں کی گولی چلی۔ مجھے یقین ہے کہ میری گولی نے خطا کی اس وجہ سے کہ شیر نے مطلق حرکت نہیں کی۔ لیکن جب عالمگیر خاں کی گولی چلی تو اس کے اعصاب میں ایک کھچاوٹ سی محسوس ہوئی اور پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر بھاگ نہ سکا۔ پھر پلٹا اور ہاتھی کی طرف حملہ کی کوشش کی۔ میں نے گولی چلائی یہ لگی۔ ایک غصہ کی آواز نکالی اور گر گیا۔ یہ ایک نر شیر تھا۔ اصولاً یہ عالمگیر خاں کا تھا مگر رہا میرے ہی حصہ میں۔

اس کے بعد میں بارہا ایسے شکاروں میں شریک ہوا۔ میرا سب سے بڑا شیر وہ تھا جو ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کے ساتھ میں نے بھوپال میں مارا تھا۔

ایک بار دہلی میں "سر جرمی ریزمین" کے گھر میں لینچ پر مدعو تھا۔ لیڈی ریزمین کہنے لگیں کہ انھوں نے کبھی جنگل میں شیر کو نہیں دیکھا۔ اس پر سر جرمی نے بھی کہا کہ ہم اتنے عرصے ہندوستان میں رہے لیکن اس کی حسرت ہی رہی کہ جنگل کے بادشاہ کو نیستان میں ہی گھومتے دیکھتے۔ یہ حکومتِ ہند کے فنانس ممبر تھے اور عنقریب پنشن پر سبکدوش ہونے والے تھے۔ میں نے کہا کہ اس دسمبر میں دو چار روز کو شکار کو آئیے اگر تقدیر میں ہے تو یہ آرزو پوری ہو جائے گی۔ اس پر ان کا نو برس کا لڑکا کہنے لگا کہ میرا دل بھی چاہتا ہے میں بھی شیر کو دیکھوں گا۔ لیڈی ریزمین بولیں کہ میں سینما کا کیمرہ لے جاؤں۔ شیر کی تصویر لوں گی۔ میں اخلاقاً ہاں ہاں کہتا رہا۔ مگر میرے دل میں یہ خیال تھا کہ یہ لوگ سرکس کے شیر اور شیر نیستاں کا فرق نہیں جانتے اتنا سدھا ہوا شیر جنگل میں تو ملنا آسان نہیں جو پورے خاندان کو اپنی زیارت بھی کرائے اور سینما اسٹار بھی بنے۔ پھر اس پر گفتگو رہی کہ کس رائفل کو استعمال کریں۔ میں نے کہا کہ مجھے ۳۷۵ میگنم "ہالینڈ اینڈ ہالینڈ" کا پسند ہے۔ میں نے خواہش کی کہ وہ کسی دوست سے رائفل لے کر چاند ماری کی مشق کر لیں۔

میں نے دسمبر کے مہینہ کے واسطے "سچرائی" کا بلوک لے لیا۔ اور وہاں کے بنگلہ میں ہم لوگ پہنچے ۲۴ کی شام کی گاڑی سے سر جرمی معہ لیڈی ریزمین اور "جون" کے پہنچے۔ دوسرے روز بریک فاسٹ پر ہمیں اطلاع ملی کہ شیر نے ایک پڑہا مار دیا۔ لینچ کے بعد ہم لوگ ہاتھیوں پر روانہ ہوئے۔ شیر پڑھے کو

اُٹھا کر غیر معمولی طور پر دور لے گیا تھا۔ ہمارے شکاری اس کے نشان پر جا رہے تھے۔ یہ تقریباً ایک میل کھینچ کر لے گیا تھا۔ ہم نے کئی جنگل کے ٹکڑے دیکھے مگر شیر کا نشان آگے کو جا رہا تھا۔ آخر کار ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چیتل خطرے کی آوازیں بولتی سنائی دیں۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ شیر ضرور قریب ہی ہے۔ ہم پہاڑ پر چڑھے چیتل پہاڑی کے پیچھے بڑی بڑی گھاس کے ایک جنگل کو دیکھ کر بول رہی تھیں۔ یہ جنگل بہت مختصر تھا۔ ہم نے ہاتھی جنگل میں ڈالے۔ ایک ہاتھی پر مسز جرمی اور ان کی بیوی تھیں۔ اس ہاتھی کو ہم نے پہاڑ کی جانب رکھا۔ چوں کہ شیر جب بھاگتا ہے تو ہمیشہ پہاڑ کی جانب جاتا ہے۔ پھر اس گھاس کے دوسری طرف ایک خشک دریا کی زمین تھی اور جانور کبھی میدان کی طرف نہیں بھاگتا۔ درمیان میں میرا ہاتھی تھا۔ جس پر میں اور مسز جرمی کا بچہ "جون" سوار تھا۔ اس کے برابر نواب بہادر عبدالسمیع خاں کا ہاتھی تھا۔ شیر میرے ہاتھی کے بالکل قریب کوئی دس گز کے فاصلہ سے اٹھا۔ میں نے گولی چلانے کی خواہش کو ضبط کیا۔ اس نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ "جون" اسے دیکھتا رہا۔ میں نے آہستہ سے سیٹی بجا کر مسز جرمی کے مہاوت کو اشارہ کیا۔ ہاتھی کو آگے بڑھائے۔ شیر گھاس سے آہستہ آہستہ نکلا۔ مسز جرمی کی گولی چلی اور شیر گر گیا۔ لیڈی ریڈیمن نے سینما کے کیمرہ سے شیر کے نکلنے اور گرنے کی تصویر بھی لے لی۔ یہ پورا شکار بالکل اس طرح ہوا کہ گویا پہلے سے ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ شیر نر شیر تھا اور نو فٹ دس انچ ناک سے دم تک تھا۔ شب کو بڑے لطف سے بڑے دن کا ڈنر ہوا۔

مسٹر و مسز مجید اللہ

اس شکار میں مسٹر مجید اللہ اور ان کی بیوی بھی تھیں۔ بیگم مجید اللہ خود بھی بندوق چلاتی ہیں۔ مردوں کی طرح بہادر اور جفاکش، نہایت خوش مزاج اور خلیق۔ اسی شکار میں ایک روز شام میں اور مسز مجید اللہ پیدل واپس آ رہے تھے کسی وجہ سے ہاتھی جہاں ہم نے کہا تھا نہ آ سکا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ پہلا حادثہ تو یہ پیش آیا کہ ہمیں ایک پہاڑی ندی عبور کرنی تھی۔ پانی تو اس میں ڈیڑھ دو بالشت سے زیادہ نہ تھا لیکن دسمبر کا مہینہ۔ نینی تال کی تلہٹی۔ برفانی چشموں کا پانی کیسا ہو گا۔ پل کے بجائے فقط بڑے بڑے پتھر رکھ کر چرواہوں نے راستہ بنا لیا تھا۔ مسز مجید اللہ راہبر تھیں۔ پتھروں پر ہو کر چلنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے

تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے مجھے صحیح اندازہ نہ ہوا۔ پتھر سے پاؤں پھسلا اور میں ندی میں کھڑا تھا۔ یوں تو فقط ایک یا ڈیڑھ فٹ پانی تھا مگر اتنا سرد کہ تمام جسم لرز گیا۔ پاؤں سُن ہو گئے۔ ندی کو عبور کر کے آگے بڑھے۔ برابر جنگل سے ایک شیر نے بولنا شروع کیا جو ہم سے دو سو ڈھائی سو گز ہو گا۔ مگر مسز مجید اللہ اسی طرح باتیں کرتی رہیں اور ذرا بھی خوف ان پر نہ تھا۔ ہم لوگ آٹھ بجے تک کیمپ پہنچے۔

مسٹر مجید اللہ پولیس میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ بڑے اچھے افسر ہیں۔ آج کی دنیا ان کی قدر کرے یا نہ کرے لیکن اس سے ان کے اچھے اور ایماندار افسر ہونے میں فرق نہیں آتا۔ شکار کا بہت شوق ہے۔ نشانہ بہت اچھا ہے۔ ان کی بندوق قضائے مبرم ہے جس کی قضا آئی ہو اسی پر چلتی ہے۔ ان کے والد خان بہادر امیر حسن خاں صاحب مرحوم میرے بڑے دوست تھے اور جتنے روز اسمبلی کے ممبر رہے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔

اسی شکار میں یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ایک شیر دوسرے مُردہ شیر کا گوشت بھی کھا لیتا ہے۔ تین چار روز کے بعد پھر ایک کٹرا مارا گیا۔ ہم لوگ پہنچے اور جہاں کٹرا شیر نے رکھا تھا اس کے قریب مچان باندھ کر نواب عبدالسمیع خاں کو بٹھا دیا۔ شیر مغرب سے کچھ پہلے ہی آگیا۔ ان کی گولی چلی وہیں گر گیا۔ چونکہ ان کے پاس ایک ہی ہاتھی تھا یہ شیر کو وہیں چھوڑ کر چلے آئے۔ دوسرے روز صبح کو جب شیر کو اٹھا کر لائے تو پچھلی ٹانگوں پر دو جگہ ایک دوسرے شیر کے گوشت کھانے کے نشان تھے۔ اور مردہ کٹرا یہ شیر اٹھا کر لے گیا تھا۔ نیز شیر کے پاؤں کے نشانات بھی تھے۔ قیاس یہ ہے کہ شب کو جو دوسرا شیر آیا تو اول بھوک میں اس شیر کا گوشت کھایا اور پھر جب اس مردہ شیر کے نصف کھائے ہوئے کٹرے پر نظر پڑی تو اُسے لیکر چل دیا یہ بھی نوعمر نر شیر تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک خاص واقعہ کی یاد آگئی۔ میجر کاربٹ کے نام سے کوئی شکار کا شوقین ناواقف نہ ہو گا اور ان کی کتاب سنے کہ جس کا نام کمایوں کے مردم خور ہے جم کاربٹ کے نام کو امریکہ تک مشہور کر دیا۔ جم کاربٹ نینی تال میں رہتے تھے۔ ان کی نہایت معقول جائداد بنگلوں کی شکل میں نینی تال میں تھی۔ میرے تعلقات ان سے اور ان کی ہمشیر سے بہت مخلصانہ تھے۔ بڑے اچھے اور نیک طینت انسان تھے۔

خاموش منکسر مزاج شکاری کی بدولت اس زمانے کے گورنروں اور وسیرایوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے مگر اس سے کبھی نفع نہیں اٹھاتے تھے۔ بڑے اچھے شکاری تھے مگر جانوروں کے تحفظ کے بھی بڑے حامی تھے۔ سوائے مردم خور شیر کے یہ عام طور پر شیر کو نہیں مارتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں ۱۷ اکتوبر کو میں نینی تال سے شکار کو روانہ ہوا۔ ہفتہ شکار میں اسی غرض سے صرف کیا جاتا تھا کہ ملازمین لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاؤس کو درست کرلیں۔ موہن بلوک رزرو تھا۔ جم کاربیٹ نے میرے شکار کا اہتمام کیا تھا اور میرے ساتھ تھے۔ پہلے ہی روز جب ہم شکار کے بنگلہ پر پہنچے تو جم نے کہا کہ چند باتیں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ بعض اوقات جنگل میں یکایک شیر کا سامنا بہت قریب سے ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یاد رکھئے کہ پلٹ کر بھاگنے کی کوشش خطرناک ہے۔ انسان شیر سے ضرور ڈرتا ہے مگر شیر بھی انسان سے کچھ کم نہیں ڈرتا۔ چنانچہ قریب سے آمنا سامنا ہو جائے تو برابر اس کی طرف دیکھتے رہنا چاہیئے۔ پھر شیر کو حملہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن منہ موڑ کر بھاگنے سے اسے ہمت ہوتی ہے کہ یہ ڈر گیا اور حملہ کر بیٹھتا ہے۔ ایسی حالت میں یا تو شیر غرا کر ہٹ جائے گا اور ایسا نہ ہو تو پیچھے کو ایک ایک قدم آہستہ آہستہ ہٹنا چاہیئے۔ لیکن نظر شیر پر ہی رہے۔ ایک بات یہ بھی بتائی کہ اگر شیر حملہ آور ہو تو جو چیز آپ کے پاس ہو۔ اس کی جانب پھینک دینی چاہیئے۔ کوٹ۔ ٹوپی۔ چادر تو شیر کا حملہ اول اس پر ہوتا ہے اور آپ کو بچنے یا گولی چلانے کا موقع مل جاتا ہے۔

آپ بیتی مردم خور شیروں کی کہانیاں بہت سناتے تھے۔ ان کا ایک یہ بھی تجربہ تھا کہ مردم خور شیر اگر کسی جنگل میں ہو تو اس کا حملہ ہمیشہ اس طرف سے ہوگا۔ جس جانب کو ہوا جا رہی ہو۔ اس کی وجہ وہ بیان کرتے تھے کہ شیر جب جنگلی جانوروں پر حملہ کرتا ہے تو ہمیشہ ہوا کے رخ کا لحاظ کرتا ہے۔ ورنہ جہاں جانوروں نے شیر کی بو سونگھی اور بھاگ گئے۔ وہ ہمیشہ جس طرف سے ہوا آرہی ہو اس کی مخالف سمت سے حملہ کرے گا۔ شیر کو اس کا احساس نہیں ہے کہ حضرت انسان اپنی مصنوعی اور غیر فطری طرزِ زندگی کی بدولت سونگھنے کی اس طاقت کو کھو چکا ہے جو دوسرے جنگلی جانوروں میں اب تک موجود ہے۔ اس واسطے وہ انسان پر بھی حملہ کرتے وقت ہوا کے رخ کا ضرور خیال رکھتا ہے۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اکثر زخمی شیر یا شیرنی مردم خور ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زخم کی وجہ سے یا بچہ دینے کی وجہ سے جب شیر یا شیرنی اتنے کمزور ہوں کہ جانوروں کا شکار نہ کر سکیں تب بھوک سے بے تاب ہو کر آدمی پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ جب انھیں محسوس ہو گیا کہ یہ اتنا آسان شکار ہے پھر عادی ہو جاتے ہیں۔ میجر کاربیٹ جانوروں کی آواز یا دوسرے حرکات سے بہت صحیح اندازہ لگاتے تھے۔

اکثر لوگ جنھوں نے ان کی کتاب "کمایوں میں مردم خور" پڑھی ہے مجھ سے دریافت کیا کرتے ہیں۔ کیا واقعی میجر کاربیٹ نے شیر کو آواز سے بلا کر مار دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔ اسی شکار میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ایک روز میجر کاربیٹ اور میں بنگلہ سے نکل کر جنگل کی ایک سڑک پر ٹہلنے نکلے۔ سورج غروب ہی ہوا تھا۔ پہاڑ کی طرف سے ایک شیر کے بولنے کی آواز آئی۔ کچھ دیر بعد وہی آواز کچھ اور فاصلہ سے آئی۔ جم کہنے لگے کہ یہ شیرنی اس جنگل کے شیروں کو اپنی آواز کے ساتھ پہاڑ کی طرف لیے جا رہی ہے ہمارا شکار خراب ہو جائے گا۔ لیکن میں اسے واپس بلا لوں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ مگر میں نے کہا کہ اگر ممکن ہو تو بلا یئے۔ انھوں نے میرے سامنے اس طرف کو منہ پھیر کر اور دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کے گرد دائرہ بنا کر بالکل شیر کی سی آواز نکالی۔ شیرنی بجائے دور جانے کے ہم سے قریب آ کر بولی۔ جم نے پھر آواز دی۔ اس نے قریب تر آ کر آواز دی۔ اور تیسری بار ہم سے سو ڈیڑھ سو گز پر آ کر بولی۔ اس کے بعد میں نے ان سے یہ کہہ کر منع کر دیا۔ اب ختم کیجئے۔ اگر سڑک پر آ کر اس لیڈی نے دیکھا کہ ہم دونوں اس سے مذاق کر رہے ہیں تو یقیناً ناخوش ہو گی۔ اور چپراسی کے ہاتھ میں صرف مرغ مارنے کا سامان ہے۔"

مجھے آج تک حیرت ہے کہ ایک انسان کے گلے سے ایسی زبردست اور خوفناک آواز کیونکر نکلتی ہے۔

سال ہائے گذشتہ کی طرح سال ۱۹۳۲ء بھی قریب ختم ہوا۔ لیکن ملک کی عام فضا اس درجہ مکدر ہو چکی تھی کہ اس کا تصور بھی امن و عافیت کے زمانے میں مشکل ہے۔ صرف صوبہ بنگال میں ۱۹۳۲ء کی جنوری سے جولائی تک سولہ مواقع پر پولیس کو گولیاں چلانی پڑیں جس میں تیرہ آدمی مارے گئے۔ چٹاگاؤں کے یورپین کلب پر حملہ کیا گیا جس میں پستول اور بم استعمال کئے گئے۔ ایک یورپین عورت قتل ہوئی اور تیرہ زخمی ہوئے۔ گو شورش عام تھی لیکن بنگال کی حالت خاص طور سے تشویشناک تھی۔

مہاتما جی نے ۱۲ر ستمبر کو برت رکھا کہ اگر کمونل ایوارڈ کے مطابق ہریجن طبقہ کے لئے جداگانہ انتخاب قائم رہا تو موصوف روزہ رکھ کر جان دے دیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہریجن کے لیڈر جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہو گئے اور مہاتما جی نے اپنا روزہ ختم کر دیا۔ سوراجسٹ ممبروں نے اسمبلی سے علیحدگی اختیار کی اور اب ان کا رُخ کونسلوں کی بجائے قید خانہ کی طرف تھا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ میری ہوم ممبری کا ساتواں سال ختم ہو رہا تھا اور رختِ سفر باندھا جا رہا تھا کہ بڑے دن کی تعطیل کے بعد دو ایک دن کے لئے چارج حوالے کرنے آ جاؤں گا۔ حسب معمول تعطیل میں چھتاری گیا۔ پہلی جنوری کے گزٹ سے معلوم ہوا کہ مجھے K.C.S.I دیا گیا۔ اس کی مجھے خوشی ہوئی۔ اسی کے ساتھ میری ہوم ممبری کی چھ ماہ کی توسیع کا بھی اعلان ہوا۔

گورنر کو میرے جانشین کے مسئلہ میں ایک دشواری یہ پیدا ہو رہی تھی کہ ان کی نظر انتخاب کسی پر نہیں جمتی تھی۔ مجھ سے اس مسئلہ پر بارہا گفتگو ہوئی تھی۔ میں سر جگدیش پرشاد کا نام لیتا تو وہ یہ کہتے کہ دو آئی سی ایس کا ہونا آئین کے خلاف ہے۔ سر جگدیش ابھی چھٹی پر تھے۔ ان کا نام سرکاری فہرست میں موجود تھا۔ اور بھی نام زیر بحث رہے لیکن کوئی نہ کوئی فی نکل آتی تھی۔ چھتاری سے واپسی پر سر مالکم ہیلی نے میری توسیع کا بھی سبب بتایا۔

۱۹۳۳ء میں میرا آخری بجٹ کونسل کے سامنے پیش ہوا۔ میں نے ۲۱ر مارچ کو اپنا آخری جیل بجٹ ۳۱۸۶۴۹۹ کا پیش کیا اور دوران سال میں جو اصلاحات کی تھیں اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ پر اپنی تقریر ختم کی: "جب کوئی شخص نیا عہدہ قبول کرتا ہے تو اس کے ذہن میں بہت کچھ کرنے

اور کرکے دکھانے کا ارمان اور حوصلہ ہوتا ہے لیکن بے کراں ذمہ داریوں کے ہجوم میں کام شروع کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ طرح طرح کی عملی۔ مالی اور انتظامی دشواریاں سد راہ ہو رہی ہیں۔ بالخصوص یہ کہ پرانی مشین میں نئے پرزے آسانی سے نہیں لگ سکتے۔ بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ کرنے کو باقی رہ گیا۔ لیکن اس کی خوشی ہے کہ قیدیوں کی حالت بہتر کرنے کے سلسلہ میں کچھ کیا جاسکا۔"

اسی سال پولیس کا بجٹ پیش کرتے ہوئے میں نے سر سی۔ وائی چنتامنی کی تقریر کے جواب میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"میرا عقیدہ ہے کہ ایک ہی سروس کے ممبروں کے ساتھ نسل و قوم کی بنا پر ترجیحی سلوک محکمہ کے حق میں نقصان دہ ہوتا ہے اور حکومت کو بالآخر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ اس طرح کے سلوک سے پولیس سروس کے ہندوستانی ممبروں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ حکومت کو ان کی وفاداری پر بھروسہ نہیں ہے۔ میری تمام عمر کا تجربہ یہ رہا ہے کہ جس کسی نے جہاں کہیں اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں مذہب، وملک یا رنگ و نسل کا امتیاز کیا اس کو ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔"

مارچ ۳۳ء کا آخر ہفتہ تھا۔ صحیح تاریخ یاد نہیں غالباً ۲۲ر مارچ تھی۔ گورنر نے مجھے شام کو بلایا اور کہا کہ وہ چند ماہ کے واسطے وزیر ہند کے طلب کرنے پر ولایت جائیں گے اور اسی شب کو ملک معظم کے اس حکم کا اعلان دہلی سے ہوگا کہ مجھے ان کے بجائے یو۔ پی کا گورنر کیا گیا۔ پہلی جلد میں کسی جگہ سر مالکم کے سکوت، حافظ کی غزلوں اور ٹوارلنگ کے خطوط کی جانب جو اشارے کئے گئے ہیں وہ اسی واقعہ سے متعلق ہیں۔ انھوں نے میری پرانی سفارش کے مطابق سر جگدیش پرشاد کو ہوم ممبری کے واسطے انتخاب کیا تھا۔ انھیں مرادآباد سے بلایا گیا۔ اسی شام کو نواب محمد یوسف کے ہاں بڑا پُر لطف ایٹ ہوم تھا۔ میرے ایٹ ہوم میں پہونچنے سے قبل دہلی سے ریڈیو پر اعلان ہوچکا تھا۔ ایٹ ہوم میں تہنیت کا غلغلہ تھا۔ مجھے اسی روز یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب محمد یوسف میری تقریر سے کچھ کبیدہ خاطر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سر جگدیش کے ہوم ممبر ہونے کی وجہ میں تھا حالانکہ سنیئر منسٹر ہونے کی وجہ سے ان کو ہوم ممبر کیا جانا چاہیئے تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں سر جگدیش کی ہمہ جہت قابلیت کا قائل اور معترف رہا ہوں۔ پھر ہوم ممبری پر ہمیشہ کسی مسلمان کا تقرر ہندوؤں کی نگاہ میں کس طرح دیکھا

جائے گا- یہ بھی قابلِ لحاظ تھا- دو مسلمان ہوم ممبروں کے بعد تیسرا مسلمان ہوم ممبر نہ قرینِ مصلحت تھا، نہ قرینِ انصاف-

مجھے اس بار اپنی تقریر کی مسرت تھی- پہلے کی طرح اسے کسی حادثہ سے نسبت نہ تھی-

یکم اپریل کو کونسل میں رخصتی تقاریر ہوئیں- کونسل سے جدا ہونے کا مجھ پر اثر تھا- گزشتہ بارہ سال سے کونسل میری زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی- اس سلسلہ کا برہم ہونا شاق تھا- میں اس موقع پر الوداعی تقاریر کا اقتباس درج کر رہا ہوں" میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے اُس کی سیاسی زندگی کے ایک خوشگوار پہلو پر روشنی پڑتی ہے- حکومت کی پارٹی جب بھی تھی اور اب بھی ہے- اسی طرح مخالف پارٹی کا وجود پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا- لیکن آپس کے تعلقات باوجود سیاسی اختلاف رائے کے کیسے شگفتہ ہوتے تھے- ان تقاریر سے ظاہر ہوتا ہے اختلافات کی گرد خلوص کے آئینہ کو مکدر نہ کرتی تھی- مخالفین اور معترضین اپنی تقریروں میں ایک طرح کا رکھ رکھاؤ مدِ نظر رکھتے تھے اور حکومت کوئی اچھی بات کرتی تو ایک حد تک اس کی داد بھی دیتے- اسی طرح حکومت بھی مخالف اقلیت کا احترام کرتی- یہ نہ تھا کہ برسرِ اقتدار اکثریت فہم و فراست- وطن دوستی اور صداقت شعاری کی اپنے آپ کو تنہا اجارہ دار سمجھے اور اس حلقہ سے باہر جو لوگ ہوں ان کی کوئی بھی بات لائق اعتنا نہ سمجھے!

اخلاق و آداب کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا کسی حال میں کسی کے لئے خواہ وہ فرد ہو یا جماعت گوارا نہیں کیا جا سکتا- ترشی و تلخ الفاظ ممکن ہے کہ ایک مضبوط معاملہ کو کمزور کر دیں لیکن کمزور مسئلہ کو طاقتور نہیں بنا سکتے-

PROCEEDINGS OF THE LEGISLATIVE COUNCIL OF THE UNITED PROVINCES

Saturday, 1st April, 1933

References about the Hon'ble Nawab Sahib of Chhatari

By C. Y. Chintamani :

Sir, by your leave I desire to say a few words on behalf of myself and all those with whom I have the honour to act in this House on this the last day on which our honourable colleague, the Home Member, sits with us as a member of Government and as a member of this House. The Hon'ble the Nawab Sahib was one of the first batch of members of the reformed Council. Those who were then here will remember that young as he was in years he was also among the more promising of new members. Early in his career he began to take an active part in the proceedings of the Council and those who had the privilege of becoming his friends had no difficulty in concluding that here was the coming man. The Hon'ble Nawab was progressive in his opinions. It is not, perhaps, generally known that in that very year, in the month of July, I believe, he was member of a deputation of the United Provinces Liberal Association which waited upon Lord Reading and pleaded for early liberalization of the constitution as Indians were not satisfied with what had been granted under that Act..The Hon'ble Nawab became a member of Government on the transferred side soon after. I personally shall always be beholden to him for having upheld and also carried forward the measures of temperance reform which had been inaugurated in the previous year. His interest in the subject was indeed so keen that he set up an Excise Conference the recommendations of which were quoted more than once with approval and appreciation here. When, in 1927, there was an important debate in this House the Hon'ble Nawab, although he became Home Member by that time, intervened in the debate in-order to support the policy of

his successor and to stress the readiness of Government to adhere to that policy. If I contrast his attitude of January 1927 with that of February, 1933, when a similar debate took place here, although in different circumstances, and when I recall that the Hon'ble Nawab did no more than vote with the Government as was his duty and did not get up as a former Excise Minister and embarrass us by a speech, I have reason to be grateful for that also. One more circumstance I may be permitted to mention here. Among the many unpleasant duties which it has fallen to me from time to time as a member of the opposition in this House, none was more than the motion of adjournment that I had to make in December, 1928, as a protest against the very unpleasant and extraordinary incidents connected with the visit of the Simon Commission to this city. Those who would read the Home Member's speech on that day would find that it was no pleasure to him to have had to defend incidents which he deplored as much as any one else, and if in politics men had to penetrate beneath the surface to get at the true meaning of every avoidance of acts, the circumstances that the Home Member allowed the motion of censure to be carried without a division cannot but be recalled with satisfaction and gratification by his personal friends and admirers. During the time the Hon'ble Nawab has been Home Member, the province in common with the rest of the country has had to bear much and to suffer much, but the Hon'ble Nawab reduced to the minimum the occasions on which he came personally into conflict with any section of opinion by not becoming the spokesman of the Government in reply to the opposition on most of those occasions.

.... Is there anyone who has known him here, or who has known him outside, who has ever been able to pick up a quarrel with him (*applause*), howsoever much howsoever violently one might disagree with him ? Has one found it possible to think bitterly of him ? Has one's personal relation with him ever been affected ? In fact I had once to complain to him that while the acts of the Government were so unpopular, and while he, as a member, was being so much attacked, it was impossible for any body to feel any bitterness against him, because his reply to the most violent criticism would be a friendly smile. The quality of courtesy, amiabi-lity, genius for friendship and generous hospitality are combined in his case with great common sense, with a capacity which not many others possess of sensing the atmosphere of the House on every critical occasion and with the unfailing habit of conducting himself so as to make the most unpleasant tasks the least unpleasant when he performs them. The Hon'ble Nawab has sat on the Treasury Bench for now nearly ten years. I am glad to think, Sir, that he is not to go straight into the life of a private citizen. We know that within a week he will be called for the seeond time to a more exalted office (*applause*). Apart from the special pleasure which his personal friends and admirers must feel, every Indian most rejoiced at heart that for the second time a highly esteemed Indian nobleman of this Province is occupying the highest position in the province and this is more welcome now than it was on the first occasion, because then he only occupied that position by act of God in circumstances which called for great regret, whereas now he goes there duly appointed by His

Majesty to be the Governor of his native province (*applause*). As one who claims to be a humble friend of his, I wish that his tenure of office as Governor may be attended with every circumstances of peace and prosperity, and that there may be no occasion for his countrymen of this province to feel that although one of them is the Governor, regrettable incidents are the order of the day. When his tenure of office is over and when he becomes a common man like the rest of us, we look forward to his coming back to a future Legislative Council, whether we may approve of the constitution of that council or not, and to his taking his proper place among the advocates of national unity and social efficiency, among those who by their example and their exertion will help lead forward the United Provinces as a part of India onward and upward to that higher status among the nations for which we all ardently aspire.

By Nawabzadah Mohammad Liaqat Ali Khan :—

Sir I associate myself with what has already been said by the Leader of the opposition and the Leader of the Independent Party. I have not had the good fortune of knowing the Nawab Sahib in his capacity either as a non-official member of the Council or as a Minister. When I came to the Council the Nawab was occupying the same office as he is doing to-day. I can say without any fear of contradiction that the Nawab of Chhatari, as Home Member, has been as responsive and responsible to the public opinion as the Minister in the Transferred Departments. Sir, his charm of manner and unfailing courtesy have won the hearts of all those who have come in contact with him. He has always been very helpful and very accommodating and even on occasion

when he differed from non-official members of this House. When he had to defend the policy of those on whom the Nawab Sahib had no control he was always smiling and there never was any bitterness. Sir, the Nawab of Chhatari by his ability and tact has shown that Indians are fit to occupy the highest office in the Province. His appointment as Governor of these Provinces when His Excellency Sir Malcolm Hailey goes to England, is a compliment not to himself but to the people of this Province in general and to the Zamidars, in particular. Sir, on behalf of my friends and myself I offer him the best of wishes and I hope he will prove a very successful Governor. We hope we shall see him in the next reformed council, and lead the people of this province a work for which he is eminently fitted.

By Rai Bahadur Babu Vikarmajit Singh :—

Speaking on my own behalf and on behalf of the members of my party I associate myself with all that has been said by the Leader of the Opposition and by my two other friends who have preceded me. It has been my proud privilege to have been one of his oldest colleagues in this House. I remember the days when the Nawab Sahib of Chhatari entered in this House and he and I at that time were, as beginners, back-benchers, but he very soon began to make his mark and I will not be disclosing a secret if I were to say that he caught the fancy of one, the then minister, at an early stage. .... Sir, his rise in the Council has been phenomenal and it has given us always very great pleasure, and it has been due to the various qualities and virtues that he is possessed of.

The great outstanding virtue, as has been mentioned, is his un-failing courtesy. As a non-official member, subsequently as a Minister and again as Home Member and now as Governor designate his courtesy never failed. As a matter of fact, if there has been any change, I should say that by the rise in his office his courtesy has been rising so to say, and in his case the saying :- "The greater the man the greater his courtesy" seems to be true. By his courteous treatment he has endeared himself to all the members of this House. .... He has, as a Member of the Government, always conducted himself with great dignity and has administered his department with tact, ability and statesmanship. During these troublous days we know that a number ot questions have been arising from time to time and he has always given his most sympathetic consideration to any request that has ever been made by members of this House.

By Khan Bahadur Hafiz Hidayat Hussain :—

Sir, to bid goodbye to the Nawab of Chhatari is a great wrench for his friends even through he may be transferring himself to the sanctified cloisters across the road. The Nawab is most amiable, most courteous, posessed of transparent sincerity and honesty of purpose. I can only say about him.

زفرق تابقدم هر کجا که می نگرم—کرشمه دامن دل می کشد که جا اینجا است

Sir, he has risen from an ordinary member of this House to the highest honour which is under the powers of the crown to confer and none of us has any doubt that he will discharge the onerous and responsible duties of that exalted office to the satisfaction of every body

concerned during his tenure of office. His personality is such that men of every community have got absolute trust in him and no body can say for one minute or can ever conceive that he can think ill of anybody. On the contrary, his thoughts always move in the direction of doing good to others. He is noble in words, in deeds, and in look. He, Sir, is the first man throughout India who introduced democracy in the reserved subjects. He has opened and placed his cards before every section of the House and has taken us into complete confidence. I can only hope that the place he leaves today will not be left vacant by him and that in the next Council we will see him occupying the position of the Chief Minister. We hope he will rise further and one day will be one of the permanent Governors. With these words and with a heavy heart I bid him goodbye on behalf of myself and my party.

By the Hon'able the Finance Member :—

Sir, I would also like to associate myself with the congratulations and compliments that have been paid to my honourable friend. I am speaking not only on behalf of the officials who sit behind me, but I am also speaking on behalf of every official throughout the province in every single service. Those of us who know him, not only admire and respect him, but we love him. Even those who only know of him admire and respect him .... I am not going to tell him that he will have my cordial co-operation and support in all his undertakings as Governor, that is merely my duty. Besides there is no need to say it because he knows it; being the friends that we are, he can have no doubt about it All I am going to say is God bless the

Nawab and may his time as Governor be success, and with your permission I will take advantage of my proximity, and shake his hand.

The Hon'ble Minister of Education :—I rise to associate myself with what has been said by leaders of various parties. I have known Nawab Sahib for the last fifteen years and during all this time he has been a good friend to me .... Since 1931 we have become colleagues. I can tell the House that his advice has been a greatest help to the Ministers. I have never turned to him in vain for the solution of complicated problems. There is no knot which he cannot untie. He possesses rare powers of statesmanship and the various speakers who have preceded me have borne testimony to this. There is one thing to which I wish to refer here particularly, and that is that communalism is foreign to his nature. He has never made any difference between a Hindu and a Musalman as such. In that sense he is a true patriot. Sir, we all know that his administration of law and order has won for him the admiration of the public as a whole, even of the Congress men, even of those who are in jail. No greater tribute could be paid to him than this.

By The Hon'ble the President :—

As one who has the privilege of being the spokesman of this House I associate myself whole-heartedly with what has been said about the Hon'ble Captain Nawab Sir Mohammad Ahmad Said Khan. I do so also not only as president of this Council, but if he will allow me to say so, as an old friend. For the first time we met at the public meeting in Meerut during the great War when he and I had the honour of addressing a meeting under the Presidentship of Sir

Harcourt Butler. That was, perhaps, in 1917. That was the first glimpse I had of the Nawab and his oratory. In 1921 he and I entered the Council together and we had the great privilege of sitting cheek by jowl side by side, and we soon began to exchange familiarities. What struck me then about the Nawab Sahib was not only his inherent courtesy, his inborn Rajput chivalry, but also his great modesty and humility. He has always reminded me of what is said by Bhatrihari:— अनुद्धता, सत्पुरुषा, समृद्धाभिः (Prosperity does not breed conceit in good men.)

He has risen from position to position. From a Member, Legislative Council, he became Minister, then a Member of Executive Council in the United Provinces Government. Then he went to Delhi as an executive Councillor. He went to the Round Table Conference. But never have I seen him for a second when his modesty and humility and his courtesy have left him. And it is this great point which added to his winsome smile, has resulted in what the leader of the opposition remarked, he never made an enemy. Innumberable, I think, must have been the requests made to him, but even when he has had to reject or refuse, he has left no sting in the refusal absolutely. I have taken to him numerous cases of political prisoners for classification and he was always responsive and sympathetic and even when he refused he has refused with a charm all his own. We shall miss him, the House will miss him, the House will miss its amiable and popular Home Member, it will miss Captain Nawab Sir Mohammad Ahmad Said Khan, but I know he will also miss the house and although exalted office calls him elsewhere in which we wish him great success and prosperity, his heart will be with us, and I know that in the future constitution, if he is not called away elsewhere in an

exalted position, he will be back again to his natural place among the members of the house. Nawab Sahib, I wish you good speed from the bottom of my heart and wish you successful and prosperous career.

By the Hon'able the Home Member :—

Sir, I am greatly moved by the kind references that were made by the Leader of the Opposition and leaders of the various parties as well as by my colleagues in the Government. My great difficulty is that I do not know how to depict, how to portray my feelings, profound and deep as they are, in words. In all times, in every circumstance, it has been very difficult to express in words, but I am in particularly difficult circumstances when I am to bid goodbye to friends, when I am to suffer the wrench of severance of association of twelve years old, how is it possible for me to express myself adequately in words. Sir, I am not going to insult my sacred feelings towards the members of this House by using the conventional and common phraseology which is generally used on such occasions and which might have been uttered many a times by hypocrite lips. No, I won't do that, I will leave it to the genuineness of my feelings to the depths of my sentiments. If they are real, those whom I am addressing will feel it without expression on my part. They will go from heart to heart as they say in Persian :- زدل خیزد بدل ریزد

(What comes from the heart goes to the heart.)

Sir, it is over twelve years since I first came to this House, when I first met you, Sir, and my friend, the Leader of Opposition, my honourable friend, the member of the United Provinces Chamber of Commerce and the Leader of the Independent Party. My honourable friend, the member for the Chamber of Commerce, made a

hidden reference. I will like to speak on it further. When I came here one grate kindness that was done to me and which I still remember with gratefulness, was that the honourable member for Partabgarh, who was then Minister, was good enough to encourage a young and junior member of the House by offering him to be his Council Secretary. It was very kind of him. I remember this incident with a feeling of love for him. It was most encouraging to me, although unfortunately I could not accept it because being quite new to the House I wanted to remain for some time unfettered and not to join the Government Benches, but it has made such a deep mark on my heart that I can never forget it. I shall ever remember it with a feeling of gratitude. For ten years I have been a member of the Government and during those ten years I received nothing at the hands of the members of this house except kindness and support. Criticism there was, as there should be, because if there is anything of which I am perfectly sure after my ten years, experience in the Government, it is that for good administration it is as necessary to have strong and critical opposition as a vigil ant Government. There was criticism but I never had any experience of any hostile feeling from any side of the House. I remember those days when the *Surajist* party was in the House, I miss today Pandit Govind Vallabh Panth very much, but even with the *Surajist* Party I never experienced any hostile feeling. There is one other thing which I wish to say and I think I owe it to every section of the House to say it now publicly, that during the last ten years that I have been the member of this Government I was never attacked or harassed or embarrassed in any way on communal grounds by any

section of the House and I am sincerely grateful for this ....
.... I will remember with gratefulness all the kindnesses that I received at your hands and they will be my most precious treasure. In the end Sir, I would ask them for one more favour. They have done me so many favours. I hope they will do one more, namely that although my connection is going to be severed from this House very soon, as long as I am connected with this Government in some other capacity I beg of them to extend the same help and support to me as they did when I was within the four walls of this House. Now, Sir, with your permission I may say a few words to you. As you mentioned yourself, I remember very clearly the morning, it was in the month of February, perhaps the 14th, when we were sworn in and I had the pleasure of sitting by you. During these twelve years I have learnt a lot from you : Your advice, your support, your suggestions were always at my disposal and believe me, Sir, that I am taking with me a feeling gratefulness and love for you. Now, Sir, I must bid goodbye to my friends here, to friends who were always dear to me, who shall always be very dear to me, to friends whose love will always be in my heart, and I shall cherish it as one of the most precious possessions of mine :—

اٹھو جاتے ھوں میکدے سے میر

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

بارِ دیگر گورنری ۱۹۳۳ء

اس سال عید الضحےٰ میں نے لکھنؤ ہی میں کی۔ ۷ر اپریل کو عید تھی اسی روز میں نے سر مالکم ہیلی سے گورنری کا چارج لیا۔ عید کی نماز عید گاہ میں ادا کی۔ بڑا مجمع تھا۔ گو میں نے چارج اُس وقت نہیں لیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری طرف سے لوگوں میں طرب و تفاخر کا جذبہ موجزن ہے۔ میرے ساتھ سید عین الدین صاحب۔ صغیر اور عثمانی تھے۔ یہاں پر میں اپنی بعض دلی کیفیات کا خاص طور پر اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اسی عید کے موقع پر اور اسی گورنری کے سلسلہ میں چند لمحوں کے اندر مجھ پر کئی اثرات طاری ہوئے۔ عام طور پر لوگوں کو مسرور دیکھ کر میرا دل ان کی طرف سے فرطِ تشکر سے لبریز ہو گیا۔ قریب کے عزیزوں دوستوں کو شادماں دیکھ کر میں خود شادماں ہوا جیسے میں نے ان کے ساتھ اور انھوں نے میرے ساتھ کوئی بہت اچھا غیر متوقع سلوک کیا ہو لیکن تھوڑی ہی دیر میں جب میں نے نماز کی نیت باندھی تو مجھ پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی اور وہ تمام باتیں جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا دفعتاً دل سے محو ہو گئیں۔ اپنے کو خدا کے حضور میں پا کر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے میرے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں اور میں نے اپنے آپ کو اس بڑے عہدہ کی ذمہ داری کے مقابلہ میں پسپا ہوتے ہوئے پایا۔ مجھے اپنی ہر استعداد نا قابلِ اعتبار معلوم ہونے لگی۔ میں نے گڑگڑا کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا اور کہا اے میرے مالک تو ہی بتا میں کدھر جاؤں اور کیا کروں۔

سیاسی شورش پورے شباب پر تھی اور لارڈ ولنگڈن اسے پوری طاقت سے دبا رہے تھے گو اس بار مسلمان اس تہلکہ میں اتنی تعداد میں شریک نہ ہوئے تھے جس قدر اس سے پہلے ہوئے تھے لیکن تمام قید خانے بھرے ہوئے تھے۔ میں بڑے تردد میں تھا۔ اُس زمانے کا گورنر آئینی گورنر نہ تھا کہ اپنی ذمہ داری ممبرانِ حکومت پر ڈال کر سبکدوش ہو جاتا۔ وہ ایک جانب تاج کا نمائندہ اور شاہی اقتدار کا حامل ہوتا تھا۔ جہاں جاتا شاہی شان و شکوہ سے اس کا استقبال ہوتا تھا۔ دوسری طرف خود ہی اپنا وزیر اعظم

ہوتا۔ انتظامی بندوبست کی تمام تر ذمہ داری اس کی تھی۔ وہ اپنی حکومت کے فیصلہ کو مسترد کر سکتا تھا۔ ضرورت ہو تو رہ احکامات نافذ کرنے میں اختیارِ مطلق کو کام میں لا سکتا تھا۔ وائسرائے سے براہِ راست خط و کتابت مہینہ میں دو بار ہوتی تھی۔ حکومتِ ہند کی نظر میں صوبہ کے انتظامات کی اصلی ذمہ داری اسی کے سر تھی۔ ممبران گورنمنٹ کو یہ حق تھا کہ اگر گورنر کو ان کی رائے سے اتفاق نہ ہو تو وہ اس کی خواہش کریں کہ ان کی رائے وائسرائے یا وزیرِ ہند کے علم میں لائی جائے۔ بایں ہمہ فیصلہ کرنا اور اس کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا گورنر کا کام تھا۔ ایک جانب شورش کا طوفان اُمڈتا چلا آ رہا تھا اور حکومت کے سفینہ کو پاش پاش کرنے پر تلا تھا۔ دوسری جانب حکومتِ ہند اقتدارِ حکومت کو بہر حال قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر ایک ہندوستانی گورنر کی حالت کسی طرح قابلِ رشک نہ تھی۔

میرے تقرر کو تین ہی ہفتہ گذرے تھے کہ مہاتما جی نے "ہریجن" تحریک کے سلسلہ میں پہلی مئی کو اکیس دن کے روزہ کا اعلان کیا اور آٹھ مئی کو "سول نافرمانی" کی تحریک کو ایک ماہ کے واسطے ملتوی کر دیا۔ ۷ ارجون کو کانگریس کے پریسیڈنٹ نے ایک اور اعلان کیا جس میں اس تحریک کا مزید التوا چھ ہفتہ کے واسطے کیا گیا۔ ۱۲ مئی کو کانگریس کے پریسیڈنٹ مسٹر اینی نے دوسرا اعلان کیا جس میں عام سول نافرمانی کو معہ لگان نہ دینے کی تحریک کے روک دیا گیا۔ البتہ جو کوئی اپنے طور پر سول نافرمانی کرے وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا کر سکتا تھا۔ اسی اعلان میں ڈکٹیٹر مقرر کئے گئے۔ کانگریس کو بحیثیت ایک ادارہ یا منظم جماعت کے بظاہر ختم کر دیا گیا۔

مہاتما جی نے مسٹر اینی کے اس اعلان پر ایک توضیحی بیان بایں الفاظ شائع کیا۔

"mass civil dis-obedience had been stopped because the people were no longer able to bear the rigours of repression."

سول نافرمانی کے ملتوی ہو جانے سے انتظامی فضا بہتر ہو گئی۔ اب قید خانے بھرنے کے بجائے آہستہ آہستہ خالی ہونے شروع ہو گئے۔

میں نے عید کے روز شام کو چارج لیا۔ سر مالکم ہیلی نے فرمایا کہ وہ غالباً ڈھائی تین ماہ بعد واپس آسکیں گے۔ انھوں نے مجھ سے یہ پوچھا کہ آیا میں اپنا اسٹاف خود لاؤں گا یا اس قلیل مدت کے واسطے انہی کے اسٹاف کو رکھوں گا۔ ظاہر ہے اتنے مختصر زمانے کے لئے نئے اسٹاف کے لانے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

میں نے سر مالکم ہیلی کو اسٹیشن پر خدا حافظ کہا۔ دوسرے روز سہ پہر کو قسم کھانے کی رسم کے واسطے مقرر کی۔ میں نے یہ شب اپنے پرانے مکان ۲ ایبٹ روڈ پر ہی گذاری۔ قسم کھانے کی یہ رسم مختصر ہوتی ہے لیکن نہایت درجہ احترام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ چھوٹا سا دربار ہوتا ہے جس میں سرکاری افسران اور غیر سرکاری معززین کو مدعو کیا جاتا ہے۔ تمام ممبران گورنمنٹ اور گورنر پولٹیکل یونیفارم میں ہوتے تھے۔ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس یا جو اس وقت ہائی کورٹ کے ججوں میں سب سے سینیر ہو وہ گورنر کو حلف دیتا تھا۔ اس موقع پر لال گوپال مکرجی اس فریضہ کو ادا کرنے کے لئے الہ آباد سے لکھنو آئے تھے۔ لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاؤس کے دربار ہال میں یہ رسم ادا ہوئی۔ اس طرح کے مراسم کی ادائیگی برطانوی عہد میں بڑے رکھ رکھاؤ سے ہوتی تھی۔ یہ نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے۔ جن لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا وہ پہلے سے آکر مقررہ نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اپریل کی سات تاریخ تھی اور شام کے چھ بجے تھے۔ میں اسٹاف کے ساتھ آیا اور درباری کرسی پر بیٹھ گیا۔ چیف سکریٹری نے جلسہ کے افتتاح کا اعلان کیا اور جسٹس لال گوپال نے میرے سامنے کھڑے ہو کر حسب ذیل عبارت پڑھی۔

Whereas His Most Excellent Majasty the King Emperor has appointad you. Capt. Nawab Sir Mohd. Ahmed Said Khan Knight Commander of the order of Star of India, Knight Commander of the order of India, Empire, to be Governor of United Province of Agra & Oudh. It is His Most Excellent Majasty's pleasure that your

Excellency take before me as a Senior Judge of the High Court of Judicature the oath of allegiance or oath of office."

اس کے بعد میں نے حلف وفاداری اور حلف عہدہ لیا جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

I, Mohd. Ahmed Said Khan do swear that I will be faithful and bear true alligience to His Majasty King George the 5th Emperor of India. His Heirs successors according to Law. So help me God.

اس قسم کی عبارت کا آخری جملہ "قانون کی مطابقت میں" بہت جامع اور معنی خیز ہے یعنی بادشاہ کی وفاداری بھی کسی کو خلاف قانون کوئی حرکت کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ ملک کے آئین کی عظمت اور اس کے اقتدار پر کسی کو ترجیح نہیں ہے۔

اس کے بعد میں نے عہدہ قبول کرنے کی قسم کھائی جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

I, Md. Ahmad Said Khan do swear that I will well and truely serve our Sovereign King George the 5th Emperer of India in the Office of Governor of the United Provinces and that I will do right to all manner of the people after the laws and usages of India, without fear or favour affection or ill will. So help me God.

اس عبارت کے بھی آخری الفاظ کی عظمتِ معنوی کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اس کے بعد میں بیٹھ گیا اور رسم ختم ہوگئی۔

اس کے بعد مسٹر جگدیش پرشاد جو میرے بجائے ہوم ممبر مقرر ہوئے تھے قسم لینے کے واسطے میرے سامنے کھڑے ہوئے۔

میں نے قسم دی۔ اُن کو بجائے دو حلف لینے کے جس طرح میں نے لئے تھے تین حلف لینے پڑے۔ یہ تیسرا حلف "حلفِ رازداری" جو ہر ممبر گورنمنٹ لینا پڑتا تھا۔ لیکن گورنرز اور گورنر جنرل کو نہیں دیا جاتا تھا۔ اس حلف کی عبارت حسبِ ذیل تھی۔

I, Jagdish Prasad do swear that I will not directly or indirectly communicate or reveal to any person or persons any matter which shall be brought under my consideration, or shall become known to me as a member of Executive Council of the Governor of United Province except as may be requried for the due discharge of my duties as such Member or as may specially permitted by the Governor. So help me God.

اس کے بعد تقریب ختم ہوگئی۔ جو حضرات مدعو تھے وہ چائے نوشی کے واسطے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں وہ میرے مہمان تھے۔ گورنر ہونے سے قبل میں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بورڈنگ کے سنگِ بنیاد رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ۱۴/اپریل کو میں نے اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ندوۃ العلماء کی طرف سے سپاس نامہ پیش ہوا۔ میں نے جواباً کچھ عرض کیا۔ یہ تو رسمی چیزیں تھیں، جن کا ایک ممبر گورنمنٹ عادی ہوتا ہے لیکن میں اس سے ضرور متاثر تھا کہ ارباب علم وفضل نے میرے تقرر پر اظہارِ اطمینان و مسرت کیا۔ مجھ پر سب سے زیادہ اثر مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے کا تھا۔ مسجد کا

سنگِ بنیاد رکھنے کا تھا۔ مسجد کا سنگِ بنیاد رکھنے کا حق صرف متقی کا تھا۔ اور میں اپنی نظر میں جیسا کچھ تھا وہ صرف مجھے معلوم تھا۔

میں نے اُن تمام سکریٹریوں شعبہ جات کے افسران اور ممبران کونسل کو شکریہ کے خطوط لکھے جن کے جوابات بہت ہی محبت بھرے الفاظ میں آئے۔ سر سی۔ وائی چنتامنی اور رائے بہادر وکرماجیت نے باوجود سیاسی اختلاف کے بڑے دوستانہ جذبات کا اظہار کیا۔

تہنیت کے تاروں اور خطوط کا ایک نا منتہا ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں دو ایک خط جیل خانہ سے بھی آئے تھے۔ اس خلوص پر میرا دل بے اختیار ہو گیا۔ میں نے اُن کے جوابات بذریعہ انسپکٹر جنرل جیل بھیجے۔ اس لئے کہ براہِ راست خط و کتابت ناممکن تھی۔

اسی سلسلے میں تہنیت کا ایک خط رائے بہادر کرشنا جی کا بنارس سے آیا۔ میں نے جوابات چھپوا لئے تھے البتہ دستخط خود کرتا تھا۔ جواب میں اس کا بھی ذکر تھا کہ یہ گورنری فقط دو تین ماہ کے واسطے ہے۔ رائے بہادر جی نے مجھے لکھا کہ میں اپنی پیدائش کا زائچہ اُنھیں بھیجوں۔ چنانچہ میں نے چھتاری سے منگا کر بھیج دیا۔ جس کے جواب میں انھوں نے مجھے لکھا کہ جنم کنڈلی کے حساب سے تو مجھے تقریباً ۳۳ء کے آخر تک گورنر رہنا چاہیئے۔ ہوا ایسا ہی۔ میں نو ماہ گورنر رہا اور ۲۷ نومبر کو میں نے چارج دیا۔

میری گورنمنٹ کے ممبر سوائے سر جگدیش پرشاد کے سب پرانے ہی ممبر تھے۔ سر اڈورڈ بلنٹ فنانس ممبر (۲) سر جگدیش ہوم ممبر (۳) نواب یوسف، منسٹر لوکل سیلف گورنمنٹ۔ (۴) سر جوالا پرشاد سریواستو۔ منسٹر تعلیم صنعت حرفت۔ مسٹر کلے جو بلنٹ کے بعد فنانس ممبر ہوئے اور سر جوزف کھاکا چیف سکریٹری تھے۔ میرا پرسنل اسٹاف وہی تھا جو سر مالکم ہیلی کا تھا۔ میں نے اس میں کوئی تبدیلی بوجوہات ذیل نہیں کی تھی

(۱) تھوڑے دنوں کے لئے نئے لوگوں کو لانا بے سود تھا۔

(۲) میں نے سر مالکم کے سوال پر یہ جواب دیا تھا کہ انھیں کا اسٹاف برسرکار رہے گا۔ صرف میں

نے نواب بہادر عبدالسمیع خاں کی سفارش پر ایک اعزازی اے ڈی سی اس غرض سے مقرر کر لیا تھا کہ لیڈی سعید کے احکامات کی تعمیل کا وہ ذمہ دار ہو۔ میرا اسٹاف حسب ذیل تھا۔

(۱) کیپٹن لیمب ہٹس (پرائیویٹ سکریٹری)

(۲) آنریبل لیفٹیننٹ آرتھر گرنفل (اے۔ ڈی سی)

(۳) کیپٹن لیمبرٹ (اے۔ ڈی سی)

(۴) خان بہادر لفٹنٹ رضا صدیقی (اعزازی اے۔ ڈی سی)

ناشکر گذاری ہوگی اگر میں یہ نہ لکھوں کہ کیپٹن لیمبرٹ اور رضا مرحوم نے اپنے فرائض بڑی خوبی سے انجام دئے۔ دوسرے دو افسران کے متعلق بھی کاش میں یہی کہہ سکتا۔

میں نے چارج لینے کے چار پانچ روز بعد الہ آباد کا دورہ کیا۔ حسب دستور اسٹیشن پر اہتمام تھا۔ الہ آباد کے گورنمنٹ ہاؤس کی عمارت گو چھوٹی ہے مگر خوب ہے۔ یہ ایک ترتیب سے بنائی گئی ہے۔ بخلاف اس کے لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا گیا ہے۔ یہاں سوشل مصروفیات بہت رہیں۔ مجھے سر تیج آنجہانی کی یاد شکر کے احساس کے ساتھ آرہی ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے نہ صرف ایک "ہٹ ہوم" دے کر اپنی مسرت کا اظہار کیا بلکہ دوران قیام الہ آباد میں وہ اکثر مل کر اپنی زرین رائے سے بھی مجھے افادہ کا موقع دیتے رہے۔ حسب دستور سپاس نامے پیش کئے جاتے تھے۔ جواب میں اس طرف میں ضرور اشارہ کرتا تھا کہ میں بحیثیت ہندوستانی کے اپنے اہل ملک سے کیا توقعات رکھتا ہوں۔

رام پور کا دورہ

ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور نے اپنے کرم سے مجھے رام پور آنے کی دعوت دی اور اس پر اصرار فرمایا کہ پہاڑ جانے سے قبل میں رام پور جاؤں۔ چنانچہ الہ آباد سے ۲۰ راپریل کو میں رام پور پہنچا۔ اس زمانے میں یو۔ پی کا گورنر رام پور۔ بنارس اور ٹیہری گڑھوال کی ریاستوں کا A.G.G. بھی ہوتا تھا مگر بحیثیت گورنر اسے کوئی تعلق ریاستوں سے نہ تھا۔

ہز ہائی نس نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ پھر رام پور کی مہماں نوازی تو ہندوستان میں بے مثل ہے۔ ہز ہائی نس اسٹیشن پر معہ ماہی مراتب تشریف لائے تھے۔ ہز ہائی نس نے فرمایا کہ اس سے پہلے تو وہ ماہی مراتب کو وہ کبھی اسٹیشن پر نہیں لائے تھے۔ اس واسطے کہ شاہانِ مغلیہ کا عطیہ تھے جس کی قدر انگریز نہیں جانتے۔

شب کی دعوت تھی جس میں تقریباً سو مہمان تھے۔ انگریزی مغلیہ اور ہندو کھانوں کی اتنی اقسام تھیں کہ اس زمانے میں ان کا تفصیل سے ذکر کرنا بھی شاید کسی قانونی دفعہ کی زد میں آجائے۔ بادشاہ کے جامِ صحت کے بعد ہز ہائی نس نے ایک تقریر کے ساتھ میرا جامِ صحت نوش فرمایا۔ تاجِ برطانیہ کے متعلق اظہارِ وفاداری فرماتے ہوئے اصلاحات کا بھی ذکر کیا۔ میں نے مناسب جوابات دیتے ہوئے اس پر زور دیا کہ باوجود شکوک کے نئے اصلاحات ہندوستان کے واسطے فائدہ مند ہوں گے۔

گو ہز ہائی نس نواب سر رضا علی خاں اس زمانہ میں بالکل نوعمر تھے لیکن بہت ذی ہوش۔ فہیم اور دور اندیش شخصیت کے حامل تھے۔ میں نے ہز ہائی نس میں ایک خوبی دیکھی۔ ہز ہائی نس معاملات میں مشاورت کرتے ہیں اور مشیر کی رائے خلافِ مزاج ہو تو بھی اُسے بغیر بحث مباحثہ رد نہیں کرتے۔

آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ریاستیں ختم ہو چکی ہیں۔ پرنس فقط برائے نام پرنس ہیں۔ نئی بساط ہے اور نئے مُہرے۔ چیزوں کی قدر و قیمت زیر و زبر ہو چکی ہے۔ بعض تو کچھ اس طور پر زیر و زبر ہوئی ہیں کہ بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آجاتا ہے۔

جنوں کا نام خرد ہو گیا۔ خرد کا جنوں

بہر حال اب کچھ ہی نقشہ بنے۔ رضا علی خاں نے اپنے زمانے میں رام پور کو بہت ترقی دی۔ رام پور میں انڈسٹری کا نام و نشان نہ تھا۔ اب دیکھئے تو متعدد فیکٹریاں ہیں اور کارخانے جاری ہیں۔ رام پور میں زمانہ دراز سے گاؤں ٹھیکہ پر دئیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز کاشتکار کی فلاح و بہبود کے بالکل منافی تھا۔ ہز ہائی نس ہی کے زمانہ میں ختم ہوا۔

جب انقلاب آیا تو ہز ہائی نس نے خود آگے بڑھ کر سردار پٹیل آنجہانی سے معاملات طے کئے اور

"زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" پر انتہائی فراست سے عمل کیا۔
صبح کو ہز ہائی نس نے اپنی فوج کی پریڈ بھی کرائی۔ میں نے سلامی لی۔ رام پور کے اس دستہ کی تعریف کمانڈر چیف نے بھی کی تھی۔
باغ خاص کا چراغاں اتنا خوبصورت تھا کہ ایسے چراغاں میں نے کم دیکھے ہیں۔ ہز ہائی نس کی یہ مہمان نوازی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

سہارن پور کا دورہ

میں رام پور سے سہارن پور اور وہاں سے دہرہ دون گیا۔ وہی پروگرام ہر جگہ تھا۔ سپاس نامہ گارڈن پارٹیاں۔ ڈنر اور ملاقاتیں۔ میں نے اس کا اہتمام کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے مل سکوں۔ نیز غیر سرکاری حضرات میں سے اپنے ہاں لنچ یا ڈنر پر ضرور مدعو کرتا تھا۔

دہرہ دون

دہرہ دون ہندوستان کا بڑا خوبصورت خطہ ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے دو ہزار فیٹ سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ موسم بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ یہ وادی شوالک پہاڑیوں اور ہمالیہ سے گھری ہوئی ہے۔ زمین زرخیز، پیداوار فراواں۔ قدرت نے میدانوں کی خوبی اور کوہستان کی خوبصورتی دونوں دہرہ دون کو عطا کی ہیں۔ میں اسے یو۔پی کا سری نگر کہا کرتا ہوں۔
یہاں ہندوستان کا بہترین فوجی مدرسہ ہے۔ اس زمانے میں میرا لڑکا فرحت یہیں پڑھتا تھا میں اس مدرسہ کے معائنہ کو گیا۔ وہاں کے لڑکوں اور استادوں نے مجھ پر اچھا اثر ڈالا۔ یہاں ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ بچوں کی جسمانی نشو و نما کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ انھیں دست کاری سے

بھی آشنا کرتے ہیں۔ لڑکوں کے بشرہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کھیل یا کام میں لگے ہوئے ہیں اس میں پوری دل چسپی لیتے ہیں۔ گفتگو کرنے میں ان کا طرزِ تکلم تکبر اور لجاجت دونوں سے بری اور جواب غیر متعلق حشو زوائد سے پاک ہوتا ہے۔

انھیں گرمیوں میں لارڈ ولنگڈن نینی تال میرے مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے۔ فرحت بھی تعطیل کی وجہ سے میرے پاس تھا۔ یہ تینوں بھائی اکثر لارڈ ولنگڈن سے باتیں کرتے تھے۔ ایک روز لارڈ ولنگڈن مجھ سے کہنے لگے کہ تمھارے بچوں میں جب کبھی میں فرحت سے بات کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پبلک اسکول کے انگریز بچہ سے بات کر رہا ہوں۔ یہاں کی تربیت کا اثر اتنا واضح اور کھلا ہوا ہوتا تھا۔

میں نے جس بٹیر کے شکار کا ذکر کہیں پہلے کیا ہے وہ اسی بار ہوا تھا۔ بٹیر کا شکار یہاں بہترین ہوتا ہے یہاں کا سرکٹ ہاؤس دون کورٹ بھی جائے وقوع کے لحاظ سے بہت اچھا مکان ہے۔ یہاں سے گرد پیش کے پہاڑوں کا نظارہ بہت دل فریب ہے۔

میرٹھ

چار پانچ روز قیام کے بعد میں نے بادل ناخواستہ دہرہ دون چھوڑا۔ یہاں سے میرٹھ گیا۔ یہاں بھی تقریباً وہی پروگرام تھا جو ہر جگہ۔ لیکن میرٹھ میں عوام کا مجمع سب جگہ سے زیادہ تھا۔ یوں تو ایک ہندوستانی کا گورنر ہونا کشش کا باعث تھا۔ لیکن میرٹھ میں جب میں ٹاؤن ہال میں میونسپل ایڈریس کی غرض سے پہونچا ہوں تو اتنا بڑا مجمع تھا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہر طرف مکان کی چھتیں تک لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایڈریس کے بعد "ایٹ ہوم" تھا جس میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔

میرٹھ ہی کے ضلع میں باغپت واقع ہے۔ وہ باغپت جہاں میرے بچپن کا معصوم لیکن مسرور و مطمئن زمانہ گذرا ہے۔ یوں تو عزیز گرامی نواب جمشید علی خاں کا اصرار ہی مجھے باغپت لے جانے کے لئے

کے لئے کافی تھا۔ پھر اُن کی والدہ محترمہ اور میری چچازاد ہمشیرہ کا وہاں ہونا ایسی کشش تھی جس پر میں قابو نہ پاسکا۔ ایک روز سہ پہر کو باغپت پہونچا۔ ہمشیرہ سے ملا۔ مجھے اُن سے مل کر ویسی ہی مسرت ہوتی تھی جیسی بیٹے کو ماں سے مل کر ہوتی ہے۔

زمیندار ایسوسی ایشن مظفر نگر نے بھی ایک سپاس نامہ سے مجھے نوازا۔

یہ دورہ ختم کرکے میں نینی تال چلا گیا۔ اس دوران میں مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ میرے صوبہ کے لوگ اپنے ساتھی کو گورنر دیکھ کر خوش ہیں۔ اکثر سپاس ناموں میں اس طرف اشارہ تھا اور میں بھی اپنے جواب میں اس کو فراموش نہ کرتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ میرے ہندوستانی لباس کو خاص طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

میرا قلب احساسِ تشکر سے لبریز تھا۔ مختلف مجمعوں میں ہزاروں ایسے مسرت بھرے چہرے نظر آئے جن کا تصور اب تک باقی ہے۔ یہ ناقابلِ فراموش تصور مجھے تمام عمر اپنے صوبہ کے رہنے بسنے والوں کا مرہونِ منت رکھے گا۔

نینی تال

مجھے نینی تال بہت زیادہ پسند ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت اور صحت بخش بہت سے دوسرے مقامات ہندوستان میں ہیں لیکن مجھے نینی تال اپنا گھر معلوم ہوتا ہے۔ میں دوپہر کے قریب گورنمنٹ ہاؤس پہونچا۔

گورنروں کا یہ دستور تھا کہ وہ آئی۔سی۔ایس فوجی اور آئی۔پی۔ایس کے افسران کو ایک ایک ہفتہ قیام کی غرض سے نینی تال گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کرتے تھے۔ مجھے یہ طریقہ بہت پسند تھا۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ سینیر افسران سے نجی طور پر تبادلۂ خیالات کا گورنر کو موقع ملتا تھا۔ اس طرح صوبہ کے حالات پر عبور ہو جاتا تھا۔ میں نے اس طریقہ کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ جاری رکھا۔ میں نے افسران حکومت کے ساتھ غیر سرکاری حضرات کو بھی مدعو کرنا شروع کیا۔ اس طرح [illegible] اور ہندوستانی سمالوں کی ہی مسل

پارٹی ہوتی تھی۔

مئی کے مہینہ میں نواب زادہ لیاقت علی خاں اور بیگم لیاقت علی خاں ایک ہفتہ کے واسطے میرے ہاں مہمان رہے۔ نواب زادہ صاحب نے اسی سال شادی کی تھی۔ میرے واسطے اس زمانے کی تفصیلات کی یادداشت اتنے برسوں کے بعد ناممکن تھی۔ اگر راحت، فرحت اور ابن نے کھیل کے طور پر روزانہ کے مشاغل "Engagement" کی فہرستیں اپنے صندوقوں میں نہ رکھی ہوتیں۔ پارٹیوں کو ترتیب دینے میں اس کا لحاظ بہت ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے لوگ بہ یک وقت مدعو کئے جائیں جو ہم خیال وہم مذاق ہوں۔ یہ ذرا ذرا سی باتیں مہمان کی راحت رسانی میں بڑی سہولیت پیدا کرتی ہیں اور لطفِ صحبت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جن حضرات کو ایک ہفتہ قیام کی دعوت دی جاتی تھی۔ ان کی فہرست پر میں خود نظر ڈالتا تھا۔ مثلاً دو ایسی مہمانوں کی فہرستیں "فہرست مشاغل" سے درج کرتا ہوں۔

دوشنبہ۔ ۲۱؍ مئی ۱۹۳۳ء

کرنل اور مسز رحمان۔ مسٹر ہاٹن سی۔ آئی۔ ای۔ مسٹر اور مسز سولووے۔ آئی سی ایس۔ مسٹر گرانٹ آئی۔ سی۔ ایس۔ رائے بہادر کنور اور کنورانی بشیشر دیال سیٹھ۔ راجہ سید احمد علی خاں علوی۔ سی۔ بی۔ ای۔ سلیم پور۔ راجہ سر محمد اعجاز رسول، جہانگیر آباد۔ قیام کی غرض سے آئے۔

دوشنبہ۔ ۲۵؍ جون ۱۹۳۳ء

لفٹننٹ راجہ درگا نرائن سنگھ ترروا۔ مسٹر اور مسز کرشن پرشاد، آئی۔ سی۔ ایس۔ مسٹر اور مسز اے۔ این۔ سپرو۔ مسٹر اور مسز خورشید احمد۔ مسٹر ہیرن۔ مسٹر ٹیڈیچی قیام کی غرض سے آئے۔

گورنمنٹ ہاؤس

نینی تال کے گورنمنٹ ہاؤس کی عمارت بڑی شاندار ہے۔ یہ پتھر کی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس کا نقشہ پرانے انگریزی مکانوں کا سا ہے۔ میں اسے خوبصورت تو نہ کہوں گا مگر بہت پُرشکوہ عمارت ہے۔ اس کا باغ اور اس کے اطراف کی زمین بڑی لیاقت اور نفاست سے آراستہ کی گئی ہیں۔

روزانہ مشاغل

روزانہ کے مشاغل کا پروگرام حسب ذیل تھا

علی الصباح نماز اور ضروریات سے سات بجے تک فارغ ہو کر تھوڑی دیر کے واسطے رفیقِ حیات (اہلیہ) کے کمروں کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہاں بچوں سے کچھ تفریح ہو جاتی۔ اس کے بعد نیچے اتر آتا تھا اور دفتر کے کمرے میں جا کر فقط اتنا دیکھ لیتا تھا کہ ایسے فائلوں کی تعداد کتنی ہے جن پر نیلا سلپ "فوری" کا دفتر نے لگایا ہے یا گلابی سلپ "امروزہ" کا لگا ہوا ہے۔ پھر میں کھانے کے کمرے میں ناشتہ کی غرض سے چلا جاتا تھا جہاں مہمانوں کے ساتھ شریک ناشتہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہ تھا کہ ہر مہمان کھانے کے کمرے میں آئے۔ جو کمرے پر ناشتہ پسند کرتے تھے اُن کا ناشتہ وہیں چلا جاتا تھا۔ میرا ناشتہ زیادہ تر پھلوں اور کافی پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے بعد دفتر آ جاتا تھا اور ضروری احکامات لکھوا دیتا تھا۔

اس کے بعد سکریٹری یا ممبر حکومت جس کا مقررہ روز ہوتا تھا پیشی کو آ جاتا تھا مثلاً

جمعہ :۔

ساڑھے دس بجے۔ فنانس ممبر ——— بارہ بجے وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ

دوشنبہ :-

دس بجے۔ چیف سکریٹری ——— بارہ بجے وزیر تعلیمات

سہ شنبہ :-

دس بجے۔ فنانس سکریٹری ——— گیارہ بجے سکریٹری مال گذاری وتعمیرات
بارہ بجے۔ سکریٹری لوکل سیلف گورنمنٹ وحفظانِ صحت

چہارشنبہ :-

دس بجے۔ سکریٹری جوڈیشل ——— پونے گیارہ بجے ہوم ممبر
ساڑھے گیارہ بجے۔ سکریٹری تعلیمات وصنعت

اس طرح مقررہ اوقات پر یہ حضرات پیشی کو آتے تھے۔ ہفتہ کے باقی روز غیر سرکاری
حضرات کی ملاقات کی غرض سے ہوتے تھے۔ سہ پہر کو یا گورنمنٹ ہاؤس میں لوگوں کو ٹینس کے لئے
بلایا جاتا یا میں کہیں ٹینس پر مدعو ہوتا تھا۔ ہر بدھ کو میں سر جگدیش پرشاد کے ہاں ٹینس کے لئے
جاتا تھا۔

ہفتہ میں تقریباً دو لنچ اور دو ڈنر اس وجہ سے ضروری تھے کہ جو لوگ اپنا نام ملاقاتیوں
کی کتاب میں لکھ جاتے تھے انھیں بلایا جاسکے۔ میں اس طریقۂ ضیافت کو بہت پسندیدہ اور
ضروری خیال کرتا تھا۔ بحیثیت ممبر گورنمنٹ بھی میں اس کا اہتمام کرتا تھا کہ جو اصحاب کارڈ چھوڑ
جائیں انھیں چائے یا کھانے پر ضرور بلایا جائے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں بڑی آسانیاں تھیں۔
ایک اسٹاف اسی کام پر مامور تھا۔

گورنمنٹ ہاؤس میں دو ڈانس ایک جون اور ایک ستمبر میں ضرور ہوتے تھے۔ میں نے بھی اسے

جاری رکھا۔ میں خود اس فنِ لطیف سے بے بہرہ تھا اور بعض کرمفرماؤں کی کوشش کے باوجود مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی کہ اسے سیکھنے کی بھی کوشش کر سکوں۔ میں بارہ بجے تک ناچ کے کمرے میں صدر مقام پر ایک صوفہ پر بیٹھا رہتا تھا۔ اے۔ ڈی۔ سی ہر ڈانس کے شروع ہونے پر ایک خاتون کو لاکر میرے صوفہ پر بٹھا دیتا تھا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ دوسرے ڈانس کے شروع ہونے پر ایک دوسری خاتون لائی جاتیں اور پہلی خاتون رخصت ہو جاتیں۔

گورنر کے ساتھ بیٹھنے والی خواتین کا انتخاب اُن کے خاوندوں کے رتبہ کے اعتبار سے ہوتا تھا۔ مثلاً سب سے پہلے فنانس ممبر کی بیوی تشریف لاتیں پھر کسی دوسرے ممبر گورنمنٹ کی بیوی آکر بیٹھتیں۔ پھر ایسٹ کمانڈ کے جنرل کی بیوی آتیں۔ اس میں سر مو فرق بھی بدمزگی کا موجب بن سکتا تھا۔ سینیر خاتون اسے توہین خیال کرتیں اگر کسی جونیر خاتون کو اُن سے پہلے لایا جاتا۔ لہذا یہ بظاہر تفریح بھی ایک طرح سرکاری کام کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ڈانس کی پارٹیوں میں شراب کا خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ چار سو پانچ سو آدمی اگر شب کے ایک دو بجے تک ناچتے رہیں تو ظاہر ہے شراب کا خرچ کتنا ہوتا ہوگا۔

اُس زمانے کے گورنر کے فرائض اہمیت اور تعداد ہر دو لحاظ سے بہت زیادہ ہوتے تھے۔ علاوہ غیر سرکاری ملاقاتیوں اور سکرٹریوں کے مقررہ ایام کے ہفتہ میں ایک بار گورنمنٹ کی میٹنگ ہوتی تھی جس میں جملہ ایسے مسائل جن کے انتظامی نتائج دور رس ہوں یا جنھیں حکومتِ ہند سے تعلق ہو پیش ہوتے تھے۔ یہ میٹنگ اکثر لنچ کے بعد تک جاری رہتی تھی اور ممبران گورنمنٹ وہیں لنچ تناول کرتے تھے۔ علاوہ ازیں روزانہ کے فائلوں پر حکم دینا بھی کافی وقت لیتا تھا۔ وزیر متعلقہ یا کونسلر نے اپنی رائے لکھ کر ایک فقرہ "ہز اکسی لنسی ملاحظہ فرمائیں" لکھ دیا اور پوری ذمہ داری گورنر پر آگئی۔

ممبران گورنمنٹ

سر اڈیورڈ بلنٹ میرے فنانس ممبر تھے۔ یہ اُس زمانہ میں اکثر بیمار رہے۔ لیکن میرے ساتھ پورے

پورے خلوص سے تعاون کرتے تھے۔ یو۔پی کے بڑے قابل افسروں میں اُن کا شمار تھا۔ چوں کہ اُن کی صحت اس زمانہ میں خراب رہتی تھی۔ اکثر ان کا کام میں اپنے اور سر جگدیش پرشاد پر تقسیم کر دیتا تھا۔

سر جگدیش پرشاد میرے دستِ راست ثابت ہوئے۔ اُن کا تجربہ۔ اُن کی قابلیت۔ اُن کا خلوص اور ان کی پیش بینی سے مجھے بہت مدد ملی۔ سب سے بڑی مدد مجھے اس سے ملتی تھی کہ سر جگدیش پرشاد کا اور میرا نقطۂ نظر انتظامی امور میں اکثر و بیشتر یک جہت ہوتا تھا۔

سر جوالا پرشاد سریواستو کے متعلق میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ نہایت ذہین۔ دور اندیش اور زمانہ شناس ہیں۔ مجھے ان سے بہت مدد ملی۔ اُن کے گھر کے لوگوں کے تعلقات میرے گھر سے بڑے خوشگوار اور مخلصانہ تھے۔ اُن کے بچے مجھے (انکل) چچا کہتے تھے۔ لیڈی سریواستو سے میری بیوی کے بہت گہرے تعلقات تھے اور اُن کی صاحبزادیاں تو بالکل اپنے بچوں کی طرح لیڈی سعید کے پاس آتی جاتی تھیں۔ اور کئی کئی روز گورنمنٹ ہاؤس میں قیام کرتی تھیں۔

راحت سلمہٗ اس زمانہ میں غیر معمولی موٹا تھا۔ یہ بچپن کا مٹاپا تھا جو جوان ہونے پر کم ہوگیا لیکن ان دنوں کوئنی اور شیلا (سریواستو صاحب کی صاحبزادیاں) راحت کو "بی بی ایلیفنٹ" کہتی تھیں اور راحت کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔

۳ر جون کو بادشاہ کی سالگرہ کی تقریب میں تال کے کنارے پریڈ ہوئی۔ یوں تو یہ سالگرہ ہر سال ہوتی تھی۔ گورنر اور دوسرے حکامان جمع ہوتے تھے۔ گورنر سلامی لیتا تھا۔ فوج شاہی سلامی (رائل سلوٹ) دیتی تھی۔ لیکن اس سال ہندوستانی تماشائیوں کی جو کثرت تھی اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ علاوہ میدان اطراف کے راستوں اور مسجد سے متصل پہاڑی آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔

بارہ جون کو ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور نینی تال تشریف لائے اور میرے یہاں قیام فرمایا۔ مجھے اُن کے تشریف لانے سے بڑی مسرت ہوئی۔ بقول حضرت ذوق ایک مخلص دوست کی ملاقات مسیحا و خضر کے ملنے سے زیادہ پر لطف ہوتی ہے۔

لارڈ ولنگڈن کی آمد

میں نے لارڈ اور لیڈی ولنگڈن کو تشریف لانے کی دعوت دی۔ ۲۲ جون کو ولیسرائے نینی تال آئے۔ حسب معمول اُن کی حفاظت کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ گو اس سال سول نافرمانی کی تحریک رُک چکی تھی۔ لیکن خفیہ سیاسی جماعتیں دہشت ناک جرائم کر رہی تھیں اور ۱۹۳۲ء سے برابر ایسے جرائم کی خبریں ملک کے اکثر گوشوں سے آ رہی تھیں۔ میں قدرتاً اس سے فکرمند تھا۔ میں نے اس کا خاص اہتمام کیا تھا کہ جہاں کہیں ویسرائے تشریف لے جائیں میں ان کے موٹر میں اُن کے ہمراہ رہوں تاکہ اُن کے ساتھ ہر خطرے میں شریک رہوں۔

مجھے اس کا افسوس ہے کہ لیڈی ولنگڈن ہمراہ نہ آسکیں وہ ولایت چلی گئی تھیں۔ نینی تال کے راستے جابجا دروازے بنا کر آراستہ کئے گئے تھے۔ میں کاٹھ گودام سے انھیں ساتھ لے کر گورنمنٹ ہاؤس آیا۔ اُن کے آنے کے سلسلے میں ایک بڑا ڈنر اور ایک ڈانس بھی دیا گیا تھا۔ ڈانس میں بڑا مجمع تھا۔ تین سو ساڑھے تین سو آدمی تھے۔ ایسی تقریبوں میں ساغر و مینا کا دور دورہ ہوتا ہے اس لئے اخراجات بھی بے اندازہ ہوتے ہیں۔ میں عادتاً جب کبھی ڈانس دیتا تھا تو بارہ بجے تک ایک صوفہ پر بیٹھ کر تماشا دیکھتا رہتا اور اے۔ ڈی۔ سی حسب مراتب مختلف خواتین کو میرے پاس لا کر بٹھا دیتے تھے جن سے میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ لیکن اس ڈانس میں مجھے اس وقت تک رہنا پڑتا جب تک کہ لارڈ ولنگڈن بنا سیر کے بعد خود اپنی خوابگاہ میں نہ چلے گئے۔

حسب دستور سرکاری اور غیر سرکاری حضرات کی ملاقاتیں اور ایڈریس وغیرہ ہوئے۔

اسی زمانے کا ذکر میں نے پچھلے اوراق میں کیا ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے مجھ سے کہا کہ جب "میں تمہارے لڑکے فرحت سے بات کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انگریزی پبلک اسکول کے طالب علم سے بات کر رہا ہوں"۔

باوجود معمر ہونے کے لارڈ ولنگڈن نے ایک روز شام کو ٹینس بھی کھیلا۔ لیکن اُن کے اے،

ڈی اسی نے مجھ سے کان میں کہہ دیا کہ اس کا خیال رکھئے کہ ہز اکسی لینسی کو بھاگنا نہ پڑے۔ میں اُن کے خلاف کھیلا اور میں اور میرے ساتھی نے اس کا لحاظ رکھا کہ گیند اُن کے قریب ہی گرے۔ کچھ بھی ہو اتنی عمر میں ورزش کا شوق یقیناً قابلِ داد ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ زیادہ عمر ہونے پر کسی قسم کی ورزش نہیں کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت سے بہت پہلے بڑھاپا انھیں آدباتا ہے۔ تھوڑی سی مناسب ورزش جاری رہے تو عرصہ تک قوائے جسمانی میں اعتدال رہتا ہے۔ لارڈ ولنگڈن اس سے بہت مطمئن معلوم ہوتے تھے کہ سول نافرمانی روک دی گئی۔ وہ یو۔ پی کے حالات کو بھی اطمینان بخش خیال کرتے تھے۔ انھیں ہماری اس پالیسی سے اتفاق تھا کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔

دو روز قیام کے بعد وہ واپس ہوئے۔ میں کاٹھ گودام تک ان کے ساتھ گیا اور جس وقت بذریعہ فون مجھے یہ اطلاع ملی کہ اُن کا اسپیشل یو۔ پی کی حدود سے گذر گیا مجھے اطمینانِ خاطر نصیب ہوا۔ شملہ پہونچتے ہی انھوں نے مجھے حسب ذیل خط لکھا۔

Viceeregal Lodge
Simla
22-6-1933

My dear Nawab Sahib,

One line of my grateful thanks to your Excellency for all your kindness & generous hospitality to me & my staff.

We enjoyed our visit enormously not with standing the vagaries of the climate, which did not effect us (except for the lambago, which is now nearly gone) for we came away full of the charms of your Hill station.

And let me say, it was the greatest pleasure for me to find the universal approval of your being in your important post, which makes me very happy in my recommendation.

The monsoon is upon us here, and we have found the mist which is doing just as well as it did in Nani.

All good wishes and renewed thanks.

Yours sincerely,
Willingdon

راؤ عبدالحمید خاں مرحوم مغفور

اس وقت میرے سامنے مرحوم کی نوشتہ ایک نظم رکھی ہے جس میں مرحوم نے میری گورنری کی تاریخ نکالی تھی جب بار اول سنہ ۲۸ء میں گورنر ہوا تھا۔ مرحوم نواب جمشید علی خاں کے حقیقی بھائی اور میرے ماموں زاد بھائی تھے۔ بہت سادہ مزاج۔ دوراندیش اور مخلص انسان تھے۔ اس درجہ متین اور مرنجان و مرنج تھے کہ کوئی کام کتنی ہی محنت سے کیوں نہ انجام دیں کسی پر اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ حکومتِ وقت سے راؤ بہادر کا خطاب پایا۔

شاعر تھے اور شاعری کی ایک خاص صنف "تاریخ گوئی" میں بڑی اچھی مہارت تھی۔ ایک بار ایک دوست کو "سر" کا خطاب ملا۔ یہ دوست اس زمانے میں بےجا برٹش حکومت کی طرفداری کرتے تھے اور قوم پرست حضرات کو ان سے یہ شکایت تھی۔ عبدالحمید خاں مرحوم نے مصرعہ تاریخ جس میں "ق" کا تخرجہ ہے لکھا۔ "قوم کا سر کاٹ کر وہ "سر" ہوئے تو کیا ہوئے"

ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ ان کی علالت مزاج میرے لئے بڑی روح فرسا تھی مگر مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ سنہ ۴۶ء میں بتاریخ ۵ اکتوبر ان سے مفارقت ہو گئی۔ رہے نام اللہ کا۔ جو نظم میری گورنری کے موقع پر مرحوم نے لکھی تھی اسے درج کرنے میں مجھے ذرا پس و پیش ہے۔ ایک بھائی اپنے بھائی کی محبت میں جو کچھ لکھے اس کا دہرانا بدمذاقی معلوم ہوتی ہے۔ بایں ہمہ اس کو درج کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تو صرف اس واسطے کہ مرحوم بھائی کا ایک محبت بھرا تحفہ ان کی یاد آنے پر بھلایا نہیں جا سکتا۔

مرحوم منظر تخلص کرتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار میں گورنر ہوا تو مرحوم نے خود مجھے عطا کی تھی۔

اے معدنِ الطاف و کرم مخزنِ اخلاق — دنیائے ترقی کا ہے تو مہرِ منوّر
اس دور میں ہے کون ترا آمدِ مقابل — ہم عزت و شوکت و ہم رتبہ و ہمسر
یہ شان یہ عظمت یہ ترا منصب عالی — عش عش کریں گر دیکھ لیں دارا و سکندر
ہر شخص کو ہے فیض ترے دستِ کرم سے — اعلیٰ ہو کہ ادنیٰ ہو۔ گدا ہو کہ تو نگر
دولت کو ہے یہ ناصیہ سائی کی تمنا — خود آکے قدم چومتے ہیں لعل و جواہر

بے ساختہ منظر نے کہا مصرعۂ تاریخ
صدر ناز کہ نواب چھتاری ہے گورنر

۱۳ ۵ ۴۷

جب ۱۹۴۱ء میں مجھے حیدرآباد صدر اعظم کی حیثیت سے جانا ہوا تو مرحوم نے ایک نظم لکھی تھی، جس کا مقطع یہ ہے۔

ہوئی تاریخ کی جب فکر منظر
کہا دل نے۔ خدا حافظ و ناصر

۱۹ ۶ ۴۱

پردیس جانے کی تاریخ "خدا حافظ و ناصر" کس قدر بے ساختہ ہے۔

ہز ہائی نس نواب صاحب رامپور کبھی قیام کی غرض سے تشریف لائے۔ ان کے اسٹاف میں سید ابو محمد مرحوم بھی ساتھ تھے۔ مجھ سے اس مسئلہ پر مشاورت کی کہ مساجدوں کے ٹھیکے ختم کئے جائیں۔ مجھے اس اصلاح سے پوری ہمدردی تھی ہیں لئے ابو محمد مرحوم کو جو اس زمانہ میں ان کے وزیر تھے اس اصلاح پر داد دی۔

کونسل کی میٹنگ

۲۷ر جون سے کونسل کی میٹنگ شروع ہوئی۔ فہرست مشاغل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی مشغولیت غیر معمولی تھی۔ ممبران کونسل روزانہ ملاقات کو آتے تھے۔ پھر لنچ یا چاء پر مدعو کئے جاتے تھے۔ مجھ سے اکثر ممبران کونسل نے یہ خواہش کی کہ میں کونسل کو ایڈریس کروں۔ میں نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ کونسل کی فضا۔ گورنری کی رسم و روایات کی محبوس زندگی سے مجھے کہیں زیادہ پسند تھی۔ سر ایڈورڈ بلنٹ تھے۔ یہ ممبران کونسل کی جانب سے مُصر تھے کہ مجھے ضرور ایڈریس کرنا چاہیئے۔

کونسل اس زمانے میں "شیرووڈ" کی عمارت میں ہوا کرتی تھی۔ یہ عمارت گورنمنٹ ہاؤس کے احاطہ میں واقع ہے۔ جس زمانے میں گورنمنٹ ہاؤس زیرِ تعمیر تھا تو عارضی طور پہ یہاں لفٹنٹ گورنر رہا کرتے تھے۔

میں ۵ر جولائی ۱۹۳۳ء کو ساڑھے گیارہ بجے کونسل کو خطاب کرنے گیا۔ یوں تو میں ہمیشہ ہی ہندوستانی کپڑے پہنا کرتا تھا سوائے ایسے مواقع کے جب سرکاری "یونیفارم" پہننا لازمی ہو۔ مگر اس موقع پر میں نے مخصوص اہتمام سے ہندوستانی لباس پہنا اور وہ بھی پرانے رنگ روپ کا۔ میں نے شیروانی پر جے پوری ریشمی عمامہ باندھا تھا مجھے یہ ہندوستانی لباس بہت پسند ہے۔

اس تقریر کے بعض حصص ایسے ہیں جو موجودہ حالات میں بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ سیاسی اور اقتصادی کش مکش کا ڈرامہ اب بھی جاری ہے گو ایکٹرس دوسرے ہیں۔ اسٹیج بدل گیا ہے مگر کہانی تقریباً وہی ہے۔ میں نے اس طرح شروع کیا تھا۔

Mr. President and Members of the Legislature

After having attended practically every session of this Council

for over 12 years, the present was the first occasion when while still being in this province I find it impossible to do so; and you can well understand how genuine was my regret at missing my old colleagues and friends here and how anxious I was to get some opportunity of meeting you again. But I hesitated because it was only last March that His Excellency Sir Malcolm Hailey addressed you. It was in this dubious frame of mind when my hon'ble colleague, the leader of the house, informed me that my strong desire to meet you had found an echo in the mind of my friends who too had expressed a wish that I should come and address them. I was, therefore, not slow to seize this opportunity of meeting you once again and it affords me a real pleasure to come here today for, as you know the legislative council has become a part of my existence ....

The economic condition in the rural areas is unfortunately still unsatisfactory, but there is prospect of better things close ahead. Times have been bad and the financial reserves of the people have been depleted; but the power of resistance to adverse conditions has

proved surprisingly strong. Signs are not wanting that the situation is improving and we have now turn the corner, the figures of the prices show a very welcome rise, except for the Gur; infact, the price of wheat approaching the pre-war level. The price of Gur is still low, but it should improve with the increase in the number of factories. The new scheme for adjustment of the rent and revenue mentioned by Sir Malcolm Hailey is now nearly ready and will shortly be placed before the rent and revenue committee for its consideration and for such suggestions as it may wish to make. Besides this, the Government had adopted other important measures to relieve agriculturists of the part of the load of debt which has been much increased by the recent depression. The Agriculturists' Relief Bill, the Reduction of Interest Bill and the Usurious Loans (U. P. Amendment) Bill are now before you. The opinion of representative bodies of individuals, interested in the subject, of Commissioners and of District officers have been invited and received, and these will be distributed to the members of the select committee to help them in their deliberations. I have every hope that the enactment which will eventually emerge will do much to relieve the more acute financial

difficulties which are now pressing on so large a portion of the people of the province........ In short, gentlemen, for the moment the political situation is calm. It is my earnest prayer that long may it continue so. I appeal with all my heart to my country-men not to take decisions which may again lead to bitter political strife and to much avoidable sufferings. Surely there has been enough of tumult and contention. Is it not time that we turn our energies to the solution of the many and complex problems that confront us? Ear long India will have a new constitution with a largely increased electorate. I venture to think that the success of the impending reform will depend to a greater extent on the proper training of the new electorate in thier enlarged responsibilities. I have an imperishable faith in the destinies of my country and in the capacity of my country-men for ordered self-Government. But I am not unmindful of the grave dangers of misdirected mass movements, especially when they assume an economic garp. The need of organizing the voters in the method and practice of constitutional action was never more urgent than it is to-day. The task is surely big enough to demand all our efforts.

With goodwill and with co-operation among races, creeds and classes we can take a big stride forward on the road to complete self-Government. Let us avoid dissension & policies which may land us in barren confusion. There is no need to brood over the incidents of the recent past, of the opportunities missed and of the wrong turns taken. Let dead past bury its dead. Let us fixe our gaze on the future and let us take a firm resolve to make the best of the reforms that are coming, if we do, then our India, in the words of poet Tennyson, "Will rise on the stepping stone of its dead self to higher thing" I have no doubt that you as the elected representative of the people, will use your efforts to have the way for the smooth working of the new constitution and to turn the minds of the men, weary of strife towards constructive efforts.

تینوں قوانین

1. Agricultural Relief Bill.
2. The Reduction of Interest Bill.
3. The Usurious Loan (U. P. Amendment) Bill.

اس کونسل میں پیش کئے گئے۔ ان قوانین کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے کہ کاشتکار کا لگان کم کرنے اور اناج کی اس درجہ ارزانی کے بعد اگر قرضوں کو نہ گھٹایا جاتا تو کاشتکار اور زمیندار دونوں تباہ ہو جاتے پوری رقم کی ادائیگی ان حالات میں ناممکن تھی۔ انصاف کا یہ ہی تقاضا تھا۔ روپیہ یا کسی سکہ کی قیمت ایک مفروضہ چیز ہے۔ اس کی قیمت منحصر ہے اس کی خریدنے کی طاقت پر۔ جب قرضے دئے گئے تھے تو روپیہ کی خریدنے کی طاقت بہت کم تھی اور وہ بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لہذا قرضہ کی تعداد کا گھٹنا لازمی تھا تاکہ مقروض کو اس سے زیادہ خریدنے کی طاقت نہ دینی پڑے جتنی قرض لینے وقت تھی۔ یہی بات آج بھی مخالف سیاسی جماعتوں سے حکومت وقت کہتی ہے۔

ریڈ ٹیپ

یوں تو گورنمنٹ کی "ریڈ ٹیپ ازم" مشہور ہے۔ یعنی جو چیز ایک بار جس طرح ہو گئی چاہے حالات زمانہ بدل گئے ہوں۔ تقاضۂ وقت اس کے خلاف ہو لیکن ایسی پرانی لکیر کی پابندی ضرور کی جائے۔ اس زمانہ کی ایک دل چسپ مثال پرانے کاغذوں میں نکل آئی۔

میں دورے کے سلسلہ میں میرٹھ گیا۔ وہاں کے میونسپل بورڈ نے حسب دستور ایک اڈریس پیش کیا اور چونکہ گورنر ہندوستانی تھا اس واسطے بجا طور پر اُن کا اڈریس بھی اردو میں تھا جو اس خطہ کی زبان بھی ہے۔ اس میں فارسی اور اردو کے اشعار بھی تھے۔ لیکن میرے روبرو اس کا انگریزی ترجمہ پیش ہوا۔ جہ صرف یہ تھی کہ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔

ترجمہ کرنے والوں سے شکایت نہیں مگر فارسی اور اردو اشعار کا ترجمہ انگریزی میں بہت عجیب معلوم ہوا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"Come, Oh wine giver, The nightingale has started singing from the tree.

The spring has come, the beloved has come. and the consolation has come.

اسے پڑھنے کے بعد مجھے کیا چارہ تھا سوائے اس کے کہ اصلی ایڈریس طلب کروں۔ جس میں حسب ذیل شعر سے ایڈریس شروع کیا گیا تھا۔

"بیا ساقی نوائے عندلیب از شاخسار آمد
بہار آمد۔ نگار آمد۔ نگار آمد۔ قرار آمد"

اس کے بعد ترجمہ کی زحمت سے نجات مل گئی اور اصل ہی میری میز پر رکھا جاتا تھا۔ یہ تو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس زمانے کا گورنر پورے صوبہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ روزانہ کے انتظام میں نہ صرف دخیل ہوتا تھا بلکہ اصلی ذمہ داری اُسی پر عائد ہوتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ سوشل معاملات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا۔ بعض غیر سرکاری تقریبوں میں بھی اُسے دلچسپی لینا ہوتی تھی۔ اگر اُسے یہ معلوم ہو کہ کسی پر ظلم ہو رہا ہے۔ گو وہ کسی قانونی زد میں نہ آتا ہو۔ تو اُسے توجہ کرنی ہوتی تھی۔ ایک بار مجھے یہ اطلاع ملی کہ ایک لڑکی مصیبت میں ہے۔ اس کے باپ کی ریاست کورٹ تھی۔ اس لڑکی کو اس کے چچا نے لے لیا تھا اور اب وہ بھی ناخوش ہو گئے تھے۔ میں نے مسٹر ڈریک بروک مین کو خط لکھا تھا جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ گورنر کسی جزوی امور میں بھی مداخلت کر سکتا تھا۔ اکثر ایسی مداخلت انتظام میں انسانی ہمدردی کی روح پیدا کر دیتی تھی۔ مسٹر ڈریک بروک مین کورٹ آف وارڈ کے انچارج تھے۔

20, September.

My dear Drake-Brockman,

"As you are aware, one daughter of.... ....lives with her uncle.............................. "

"Last year, I am told, ... (her uncle) wanted to marry her but the .... (her father)

got an injunction issued........................ . Now, the relations between the uncle and his wife and the girl are terribly bad. I am told the girl is kept almost locked up. .... The father refuses to take her back and says she has been adopted by her uncle. I understand under the Hindu law a girl cannot be adopted. However, this is immaterial. The question is : what to do with the child who is now disowned by both sides...................... I think the fair thing would be the ....(the father) to take the girl under his protection and we may be able to persuade him to do this if we tell him we are willing to increase the allawance for the girl. If he does not agree to this then the only alternative is to send the girl to some school; but this should be done with the consent of .... (father) and ....(the uncle)."

میری رائے میں اس طرح کی مداخلت انتظامی دروبست کو ہموار رکھنے میں مفید ہوتی ہے لیکن وزیر اعظم یا گورنر کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ دوسرے وزراء یا ممبران حکومت کو ناگواری نہ ہو۔ جس تجویز سے اختلاف ہو اس کے نقائص اشارتاً بتانا یا اندیشہ کا اظہار کرنا ایسے طریقے ہیں جو کارگر ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شرکائے کار کی رہبری کی جائے۔ انھیں ہانکنے کی کوشش نہ کی جائے۔ جمہوری اور آئینی طرز حکومت میں شخصی اثر اسی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات ایسی تجاویز سامنے آتی ہیں جن کو آپ درست خیال نہیں کرتے۔ لیکن برملا کہہ دینا بدمزگی کا موجب ہوتا ہے۔ دوسری طرف ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کابینہ میں ہمنوائی مفقود ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تجویز کو فی الجملہ مناسب کہتے ہوئے اس کے کسی ایک جزو پر بحث کی جائے۔ پھر یکے بعد دیگرے دوسرے حصّوں کو لیا جائے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تجویز کی صورت ہی بدل جاتی ہے لیکن مجوز اسے اپنی ہی تجویز سمجھتا رہتا ہے۔ ایسی شکل میں ایک بات ضروری ہے یعنی ترمیم شدہ تجویز کا سہرا مجوز ہی کے سر رہنے دیا جائے۔ اپنی کی ہوئی ترمیمات کا اظہار غلطی ہے۔

ایسا کرنے سے شریکِ کار کا دل کھٹا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات اس کے اخلاص میں فرق آجاتا ہے۔

یہاں ایک قصہ یاد آ گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جو اصلاحات نافذ تھیں اُس آئین میں ایک دفعہ ایسی تھی جو گورنمنٹ کو یہ اختیار دیتی تھی کہ اگر کسی ملازم کو حکومت وقت کسی وجہ سے نا اہل تصور کرے تو اُسے قبل از وقت پنشن پر حکماً بھیج دے۔ یو۔ پی کی پولیس میں ایک افسر ظفر عمر صاحب مرحوم تھے محکمہ کے افسران اُن سے اکثر ناخوش رہتے۔ انسپکٹر جنرل نے یہ تحریک کی کہ اس اختیار کو بروئے کار لایا جائے چیف سکریٹری نے اس سے اتفاق کیا۔ سر جگدیش پرشاد ہوم ممبر تھے انھیں بھی اس سے اتفاق تھا یہ متفقہ مسئلہ آخری حکم کی غرض سے میرے پاس آیا۔ میری رائے میں یہ تجویز درست نہ تھی۔ اگرچہ قانوناً مجھے اختیار تھا کہ میں اس تجویز کو نامنظور کر دوں لیکن یہ حکم انسپکٹر جنرل، چیف سکریٹری اور ہوم ممبر سب کی متفقہ سفارش کے خلاف خود مختارانہ ہوتا۔ یہ بات میری طبیعت کے خلاف تھی۔ میں نے بجائے فائل پر کچھ لکھنے کے انسپکٹر جنرل کو ملاقات کے لیئے بلایا۔ وہ آئے تو میں نے گفتگو اس طرح شروع کی۔ آپ کی سفارش یقیناً کامل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ میں بھی اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے چاہا کہ اس میں آپ کو بھی شریک کر لوں۔ وہ یہ کہ یہ دفعہ اب تک قانون کے صفحات میں دفن رہی ہے۔ آج پہلی بار ہم آپ اس کو زندہ کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں اور اسے زندہ کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ لیکن یہ بات بھی پہلے سے سوچ لینے کی ہے کہ صندوق کا یہ جن ایک دفعہ برآمد ہو گیا تو ہمارے ملازمین پر کیا گذر جائے گی۔ آپ کا اس بارہ میں کیا خیال ہے۔ انسپکٹر جنرل نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر ذرا رُک کر کہا۔ "جناب کیا میں اس تجویز کو واپس لے سکتا ہوں"۔ میں نے کہا "ہاں بڑی مسرت سے" اور بات آئی گئی ہوئی۔

اگر معترضانہ اور مخالفانہ انداز سے بات کی جاوے تو بالعموم مخالف پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ بذاتِ خود میں نے اس طریقہ کو یو۔ پی میں گورنر کی حیثیت سے اور حیدرآباد میں وزیرِ اعظم کی حیثیت سے بہت کامیاب پایا۔ میرے رفقائے کار کو کبھی یہ شکوہ نہیں ہوا کہ میں خواہ مخواہ مداخلت کرتا ہوں۔ حالاں کہ اُن کی تجاویز میں کافی ردّ و بدل ہو جاتی تھی۔ آج بھی جب گورنر کو سوائے خاص حالات کے دخل دینے

کا حق نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ روش مفید ہی ہوگی۔ اس سے گورنمنٹ کو مدد ملے گی۔ میرا یہ بھی تجربہ ہے کہ بعض اوقات ایسے شخص کی رائے جو انتخاب کی کش مکش سے علیحدہ رہا ہو بڑی صائب ہوتی ہے۔

سر ہیری ہیگ

سر ہیری ہیگ ان دنوں وائسرائے کی کونسل میں ہوم ممبر تھے۔ یہ بمبئی سے واپس ہوتے ہوئے نینی تال میرے پاس آئے۔ ان کا یہ دورہ اس غرض سے تھا کہ صوبہ کی حکومتوں سے یہ معلوم کریں کہ سیاسی قیدی رہائی پانے کے بعد پریشان تو نہیں کرتے۔ ہمارا جواب نفی میں تھا۔ ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اور بھی کہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس زمانہ کا وہ فائل جس میں میری اُن سے خط و کتابت درج تھی ضائع ہوگیا لیکن لارڈ ولنگڈن اور ہیلی کی خط و کتابت سے مجھے حافظہ تازہ کرنے میں بہت مدد ملی۔

پولیس کا مستقبل خود مختار ہندوستان میں

چونکہ نئے آئین کی تشکیل ہو رہی تھی۔ پولیس کا مسئلہ زیر غور تھا۔ ایک طرف سے کہا جاتا تھا کہ پولیس کا انتظام اور قیام امن کا اہتمام وزراء کے سپرد ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ مثل سابق کونسلر کے تحت رہے جو بجائے کونسل کے گورنر کو جوابدہ ہوں۔ دوسری جانب ہندوستانیوں کا متفقہ یہ خیال تھا کہ اگر صیغۂ پولیس وزیروں کے سپرد نہ ہوا تو پھر صوبائی حکومت کی خود مختاری کے کوئی معنی نہ تھے۔ اس لئے پولیس کے انتظام کی ذمہ داری بالضرور وزیروں کے سپرد ہو۔ لیکن ملک کا ہر بہی خواہ یہ چاہتا تھا کہ پولیس کا محکمہ سیاسی کھلونہ نہ بن جائے اور مقامی لیڈر اپنے حلقہ میں افسران پولیس کے انتظام میں مداخلت نہ کریں اور انھیں مرعوب کرنے کی کوشش نہ کی

جا سکے۔

اس سلسلہ میں وائسرائے نے مجھے مئی کے مہینہ میں ایک خط بھیجا۔ اسی کے ساتھ وزیر ہند کے دو تاروں کی نقول بھی منسلک تھی۔ وزیر ہند نے اپنے مراسلوں میں اس پر زور دیا تھا کہ پولیس کے معاملات میں وزراء کو مداخلت سوائے خاص حالات کے نہ ہو۔ تاکہ سیاسی جماعتیں افسرانِ پولیس کو متاثر نہ کر سکیں۔ ان کا پہلا مراسلہ ان الفاظ سے شروع ہوا تھا۔

"I am greatly concerned to secure freedom of Police from interference by Ministers in matters which in this country would be scrupulously left to the executive head of the service."

اُن کا خیال تھا کہ اگر انگلستان کی طرح یہاں بھی ایسے روایات قائم ہو جائیں کہ وزراء کی مداخلت سوائے اپیل یا میموریل کے نہ ہو تو انھیں اطمینان ہو جائے گا۔ لیکن ایسی روایات کا قائم ہونے کی امید نہ تھی۔ چنانچہ اُن کی تجویز یہ تھی کہ ایک پولیس کمیشن ہندوستان آکر اپنی سفارشات پیش کرے۔ لارڈ ولنگڈن کو خود بھی اس تجویز سے چنداں اتفاق نہ تھا۔

میں نے رائل کمیشن کی تجویز سے اپنے خط مورخہ ۹ مئی میں پُر زور اختلاف کیا۔ میں نے اپنے خط میں اس اصول کو تسلیم کیا تھا کہ پولیس سیاسی کشمکش سے آزاد رہے۔ میرے الفاظ یہ تھے۔

"I fully realize the importance of keeping our Police Force out of party politics in the future Constitution of India as of maintaining the discipline and non-partisan spirit of its officers and men."

اسی مراسلہ میں آگے چل کر میں نے یہ کہا تھا کہ اس مقصد کا حصول رائل کمیشن کے ذریعہ حاصل

مناسب نہیں۔ اہلِ ہند کے دل میں اس سے شکوک پیدا ہوں گے اور وہ یہ خیال کریں گے کہ
کو وزراء کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتے۔ اور ہندوستان میں اس کی
مخالفت عام ہوگی۔ میری تجویز یہ تھی کہ انسپکٹر جنرل کو وہی اختیارات رہیں جو اُسے اُسی زمانہ میں
پولیس ایکٹ کے تحت حاصل تھے۔ پولیس ایکٹ کو بدلنے کا حق مقامی قانون ساز جماعتوں کو نہ
ہو اور ہندوستان کا پارلیمنٹ بھی اُسے گورنر جنرل کی رضامندی سے بدل سکے۔
مجھے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس پیش بینی سے کیا فائدہ اور ایسی مداخلت سے کیا
نقصان ہوتا۔ مقامی سیاسی لیڈروں کی مداخلت افسران پولیس کے واسطے مصیبت اور غریب عایا
کے واسطے عذاب ہے۔

اس کے علاوہ وزیر ہند کے ذہن میں ایک اور دشواری بھی تھی۔ وہ یہ کہ پولیس کے انتظام
کا مدار جاسوسوں کی اطلاعات پر ہے۔ اگر ان کے نام مخفی نہ رہے تو پھر کسی کو خبر رسانی کی جرأت نہ ہوگی۔
اسی سال میں نے اپنے فنانس ممبر مسٹر بلنٹ کا نام K.C.I.E کے واسطے بھیجا تھا اور
نواب صاحب رام پور کا نام K.C.S.I کے واسطے۔ لیکن ستارہ ہند کے تحت فقط ایک جگہ خالی تھی اس
لئے ہز ہائی نس کو یہ خطاب دوسرے سال ملا۔

اس زمانہ میں مجھے ایک تشویشناک اطلاع ملی کہ پنڈت جواہر لال جی کی والدہ سخت علیل ہیں۔ اس
کی اطلاع فوراً حکومت ہند کو دی گئی۔ پنڈت جی ابھی جیل میں تھے اور اُن کے آزاد ہونے کو ابھی بارہ
روز اور باقی تھے۔ اُن کی والدہ کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ ایسا انتظار ناممکن تھا۔ بعض مشیروں کی
یہ رائے تھی کہ اول گورنمنٹ آف انڈیا سے دریافت کیا جائے تب رہائی ہو۔ لیکن ہم نے فوراً رہا کرنا
مناسب خیال کیا اور ۱۶ ستمبر کے خط میں ویسرائے کو اطلاع دے دی۔ ۲۸ ستمبر کو ویسرائے کا ایک
خط ملا۔ جس میں انھوں نے وزیر ہند کی خواہش پر یہ دریافت کیا تھا کہ پولیس کے ملازمین کی تنخواہوں یا
دوسری سہولتوں کے فراہم کرنے میں کیا قدم اٹھایا گیا۔ خط کا آخری فقرہ حسب ذیل ہے۔

"I should be glade to have any information which your Secre-

tariat can collect without difficulty to show, if not the improvements that have been made, at least the steps which have been taken during these years of unprecedented financial difficulty to keep up the standard of Police efficiency."

اس کے جواب میں میری گورنمنٹ نے ایک مفصل رپورٹ بھیجی۔ جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ باوجود مالی مشکلات کے ملازمین پولیس کے حقوق کا پورے طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

ملازمین اور خاص کر ملازمین انتظامی کے جائز حقوق کا تحفظ ہر حکومت کا فرض ہے جہاں ان کی لغزش اور خطا پر وہ مستحق سزا ہیں وہاں انتظام کو ہموار رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کی تنخواہیں مناسب حال ہوں اور ان کے حقوق اور اُن کی عزت کی حفاظت کی جائے۔ ان کے کاموں میں سوائے اُن کے افسروں کے براہ راست کوئی دوسرا مداخلت نہ کرے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ پبلک اس روش کو پسند نہ کرے گی۔ لیکن میں وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ بے غرض پبلک کی ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ ملازمین سرکار قانون کے تحت آزادی سے کام کر سکیں کوئی پبلک اس کے خلاف عمل کرنا چاہتی ہے تو مجھے اس کے صحت مند ہونے میں شبہ ہے۔ میں نے پولیس کے سات بجٹ پیش کئے۔ اُس زمانے میں اکثر ممبر کسی پارٹی سے متعلق نہ ہوتے تھے۔ بہ ایں ہمہ پولیس کے بجٹ میں کچھ زیادہ کمی نہیں کی گئی۔ آج سیاسی جماعتوں کے ممبروں کو پارٹی کے "وِہپ" کی تعمیل کرنی پڑتی ہے چاہے ممبر کی ذاتی رائے کچھ بھی ہو۔ اُس زمانہ کے ممبر اس طرح پابند نہ تھے اور اس وجہ سے یہ بات قابلِ غور ہے۔ میرے زمانہ کے بجٹ اور کونسل کی مجوزہ کمی کی تفصیل ذیل ہے۔ رائے دینے والے یہ ممبر اپنے ذاتی اثر اور خرچ سے منتخب ہوئے تھے۔ چنانچہ نہ پارٹی کے احکامات کے پابند تھے نہ حکومت کے ساتھ رائے دینے پر مجبور۔

سال	مطالبہ بجٹ	کونسل نے جس سے اتفاق کیا	جتنی کمی کی	فیصدی کمی
1927-28	15271693	15256593	15100	0-10 %

سال	مطالبہ بجٹ	کونسل نے جس سے اتفاق کیا	جملی کمی کو	فیصدی کمی
1928–29	15737154	15737154	No cut	۰
1929–30	16015728	16015617	111	۰
1930–31	16483794	16483794	No cut	۰
1931–32	16407720	16307277	80503	۰-49 %
1932–33	15217197	15187197	30000	0-20 %
1933–34	15192247	15192247	No cut	۰

مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ عام لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ملک کی پولیس اور عدالتیں بے لاگ کام کریں۔

تنویر سلمہا کی پیدائش

۹ اگست کو تنویر سلمہا پیدا ہوئیں۔ چونکہ سر مالکم ہیلی کی واپسی کی تاریخ متعین نہ تھی اس لئے میں نے لیڈی سعید کو ۱۱ جولائی کو چھتاری روانہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ بھلا معلوم نہ ہوا کہ اگر سر مالکم جلد واپس آجائیں تو میں کسی سبب سے کچھ دن بھی گورنمنٹ ہاؤس میں مقیم رہوں۔ مجھے اس بیٹی سے بہت محبت ہے ۴ اگست کو اسے دیکھنے چھتاری گیا اور عقیقہ کی غرض سے ۴ ستمبر کو اس کی محبت نے مجھے دوبارہ چھتاری پہونچایا۔

اس موقعہ پر میرے دوستوں اور کرم فرما حضرات نے مبارکبادوں سے لاد دیا۔ جیسے کسی گورنر کے گھر بچہ پیدا ہونا کوئی انوکھی سی بات تھی۔ لیڈی سعید ۱۳ ستمبر کو معہ تنویر کے نینی تال واپس آگئیں۔ اس موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا۔ میں دوبارہ چھتاری گیا تھا۔ میں نے یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس سفر کا بل میرے پاس بھیجا جائے۔ لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ میرے دورے کے حساب میں مجرا کر دیا گیا۔ میرے دریافت کرنے پر وجہ یہ بیان کی گئی کہ گورنر کا سفر سرکاری ہی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک سفر کی یہ تاویل معقول نہ تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی تنخواہ سے یہ رقوم دورے کے حساب میں منتقل کر دیں۔

فلسطین کے گرانڈ مفتی اعظم سے ملاقات

۳ راکتوبر کو "فلسطین کے گرانڈ مفتی" نینی تال آئے۔ میں نے انھیں لنچ پر مدعو کیا۔ ان کا مقصد فلسطین میں یونیورسٹی کے واسطے چندہ جمع کرنا تھا۔ انھیں ویسرائے نے بھی ایک عام خط دیا تھا۔ اسی نوعیت کا ایک خط ان کی خواہش پر میں نے بھی دیا۔ میں نے تین خطوط اپنے دوستوں کو بھی دئے، جن میں دو نواب سر مزمل اللہ خاں اور راجہ سر اعجاز رسول تھے تاکہ یونیورسٹی کے واسطے کچھ چندہ ہو سکے۔ برٹش گورنمنٹ کی پالیسی مفتی فلسطین کے متعلق "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کے مصداق تھی۔

ایک طرف تو بالفور کے اعلان کے سلسلہ میں برٹش پالیسی یہودیوں کی موافقت میں تھی اور گرانڈ مفتی صاحب اس پالیسی کے سخت مخالف تھے لہذا برٹش گورنمنٹ سے ان کی دوستی ناممکن۔ دوسری جانب چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بالفور کی پالیسی کے خلاف بڑا ہیجان تھا لہذا گرانڈ مفتی صاحب کی کھلی مخالفت بھی قرین مصلحت نہ تھی۔

مسلمانوں میں اس پالیسی کی سخت مخالفت تھی۔ اور بجا تھی۔ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزارہا عرب مسلمانوں کو خانماں برباد کیا جائے اور یہی ہوا۔ اس پالیسی کی تائید میں جو دلیل پیش کی جاتی تھی وہ بجائے خود بے معنی تھی۔ کہا یہ جاتا تھا کہ چونکہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں یہودی اس ملک میں رہتے تھے لہذا انھیں یہاں بسنے کا حق ہے۔ یہ دلیل نہ تھی دھاندلی تھی۔ اگر اس طرح اقوامِ عالم کو انھیں ممالک میں واپس کیا جائے جہاں سے وہ باہر جا کر آباد ہوئیں تھیں تو تمام عالم کا موجودہ نقشہ بدلنا پڑے گا۔ دنیا کی آبادیاں تہ و بالا ہو جائیں گی۔ زمانہ گذشتہ میں جب علم تاریخ تو درکنار انسان لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتا تھا۔ مختلف اقوام ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر بس جاتی تھیں۔ مثلاً ہندوستان میں "آیرین" آئے اور یہاں کے پرانے باشندوں کو فتح کر کے یہاں بس گئے۔ کیا یہ قرین عقل ہے

کہ اُن سے کہا جائے کہ آپ پھر اپنے اصلی وطن کو واپس جائیں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ زبردست اقوام ملکی سیاسی یا جنگی مصالح کی پیشِ نظر ایک فیصلہ کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد اس فیصلہ کے جواز میں دلائل تصنیف کئے جاتے ہیں۔ دلائل کی روشنی میں فیصلہ نہیں کیا جاتا بلکہ فیصلہ پر دلائل کا ملمع کیا جاتا ہے۔ دنیا میں زبردست کا یہ سلوک زیردست کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔

ولایت سے لیڈی ولنگڈن۔ سر مالکم ہیلی اور دوسرے دوستوں نے مبارکباد بھیجی۔ سر مالکم نے لکھا۔

Our very best congratulations to you on the birth of your daughter. It must be indeed a rare event for a Governor of the U. P. to be come a father.

اینگلو انڈین اقلیت

اسی زمانہ میں ویسرائے کا ایک خط آیا جس میں انھوں نے اینگلو انڈین جماعت کی تعلیم کی طرف مجھ متوجہ کیا تھا۔ مسٹر کیمبل روڈس نے انھیں خط لکھا تھا۔ میں صرف اپنے جواب کے دو تین فقرے نقل کرتا ہوں

"I will send a detailed reply to Your Excellency later on. Mean-vhile I wish tc assure your Eycellency that I am strongly in favour f protecting the interests of Minorities and of doing every thing that s feasible and reasonable in order to afford such protection to Anglo-ndians in these Provinces."

اقلیت کے حقوق کے سلسلہ میں اس پالیسی پر دیانت کے ساتھ عمل ہوتا تھا۔

خان بہادر تصدق حسین مرحوم سی۔آئی۔ای

خان بہادر تصدق حسین مرحوم عجیب و غریب شخصیت کے حامل تھے۔ یہ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے تھے۔ ایک سب انسپکٹر کی حیثیت سے پولیس میں داخل ہوئے اور ۳۳ء میں جب یکایک ان کا انتقال ہوا تو Central Intelligence Bureau کے ڈائرکٹر تھے۔ اُن کا زمانہ ہندوستان کی پولیس نہ بھولے گی۔ سازشوں کی سراغ رسانی میں اُن کی مہارت بے نظیر تھی۔ میرے اوپر خاص کرم فرماتے تھے۔ اگر زندگی کچھ اور وفا کرتی تو ممکن ہے ڈائرکٹر ہو جاتے۔ اُن کے انتقال کے بعد ویسرائے نے مجھے خط لکھا جس میں اُن کے بیٹے ظہیر عالم کی سفارش کی تھی۔ اس خط کو اس وجہ سے نقل کرتا ہوں کہ

(۱) اس سے مرحوم کی قابلیت اور گورنمنٹ کے اعتماد کا پتہ چلتا ہے (۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت وقت اپنے کارآمد ملازمین کے پسماندگان کا کتنا خیال کرتی تھی (۳) اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گو ویسرائے ایک گورنر کو حکم دے سکتا تھا لیکن چونکہ یہ صوبہ کا معاملہ تھا۔ ویسرائے کو اس کی نزاکت کا پورا احترام تھا۔ رفقائے کار کو حکم دینے کے بجائے درست طریقہ یہ ہے کہ اشارتاً اس طرف متوجہ کیا جائے۔ بجائے اس کے کہ شریک کار کو دھکا دے کر کسی طرف بھیجا جائے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ساتھ چلنا بہتر ہے۔

Confidential

The Viceroy's House,
New Delhi,
9th October, 1933.

My dear Nawab Sahib,

The Intelligence Bureau of my Home Department recently suffered a severe loss by the death of Khan Bahadur Tassaduk Husain,

the Assistant Director. I do not know whether you know the Khan Bahadur personally, but I can assure you that he did most excellent work, and I deeply deplore his loss. He has left nine childern, and I am anxious to do what I can for them. I understand that his second son Zahir Alam is the candidate for the Deputy Collector in your Province, for which I am informed there are two vacancies at the present time. Whilst I do not wish to interfere in any way with your selection for the post, I should be most grateful if you would bear in mind the splendid record of work for Government which Tasadduk Husain rendered when considering the application of his son for the post to which I have referred above.

Yours sincerely,
Willingdon.

ظہیر عالم کا تقرر بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ہو گیا اور مجھے مسرت ہے کہ یہ ایک لائق افسر ثابت ہوئے۔

لارڈ و لیڈی ولنگڈن

اس دوران میں لارڈ ولنگڈن کو بہت ہی قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اس سے قبل کچھ روز میں اُن کی گورنمنٹ کا ممبر بھی رہا تھا۔ اب تقریباً نو ماہ تک ان کی پالیسی کے مختلف پہلو سامنے رہے۔ لارڈ ولنگڈن ایک طرف تو حکومت کے خلاف شورش کو پوری طاقت سے دبانا چاہتے تھے دوسری طرف اصلاحات جاری کرنا چاہتے تھے۔ وہ تفصیلات سے بہت بچتے تھے۔ اُن کے زمانہ میں سر مورس ہیلٹ سر ہورس ولیمسن اور سر ہیری ہیگ تمام تر کام کے ذمہ دار تھے۔ لارڈ ولنگڈن سوائے عام پالیسی کے طے کرنے کے دخل نہیں دیتے تھے۔

ملاقاتوں میں بہت خلیق اور ملنسار تھے۔ ہمیشہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ ملاقاتی کو اس کا احساس نہ رہے کہ وہ وائسرائے اور گورنر جنرل سے ہم کلام ہے۔ اس سے مساوات اور دوستی کی فضا پیدا ہو جاتی تھی دورانِ گفتگو میں اس طرح کے جملے استعمال کرتے تھے My Dear Man یا Dear friend یہ صفات لوگوں کو اُن سے مانوس کرنے میں بہت مدد دیتی تھیں۔ اگر کسی بات سے اُنھیں اختلاف بھی ہوتا تو اس اختلاف کا اظہار بہت خوبصورت پیرایہ سے کرتے تھے۔ لیکن اُن کی پالیسی کا بنیادی پہلو اسی اصول پر تھا کہ حکمرانی بلا سیاست نہیں ہوتی۔ اور اس واسطے اپنے پیش رو لارڈ ارون کی پالیسی سے کچھ زیادہ متفق نہ تھے۔

لیڈی ولنگڈن بہت شخصیت کی حامل تھیں۔ جو کرنا چاہتی تھیں اُسے کر کے رہتیں۔ انھیں ملکی اور اور سیاسی معاملات سے بھی کافی دلچسپی تھی اور بہت باخبر تھیں۔ تمام گورنمنٹ ہاؤس پر چھائی ہوئی تھیں۔ دہلی میں ان کے اختیار کی مشہور تھیں۔ اس زمانہ میں دہلی میں یہ فقرہ مشہور تھا۔ Lady Willingdon ان کی مہمان نوازی قابلِ تعریف اور لائق تقلید تھی۔ مجھے کئی بار اُن کے مہمان ہونے کی مسرت حاصل ہوئی۔ مہمان کی راحت رسانی میں وہ کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی تھیں۔ خود ہر چیز ملاحظہ کرتی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایسی تفصیلات کی ذاتی بھی نگرانی کرتی تھیں۔ مثلاً آتش خانہ روشن ہے یا نہیں غسل خانہ میں نہانے کا ٹب ہے یا نہیں۔ پھر صبح کو مہمان ناشتہ کس وقت کرنے کا عادی ہے شب میں مہمان کو نیند کیسی آئی۔ لارڈ ولنگڈن خود کہا کرتے تھے کہ اُن کے دل میں ترقی کی خواہش اُن کی بیوی نے پیدا کی ورنہ وہ خاموش زندگی بسر کرتے۔

سر مالکم ہیلی کی خط و کتابت کے مطالعہ سے کچھ اور واقعات یاد آگئے۔

اسی زمانہ میں "الگن مل" اور "وکٹوریا مل" میں اسٹرائک ہوا۔ محرم قریب تھا اور میں اس تردد میں کہ کہیں یہ ہڑتال محرم کے زمانے میں کچھ اور رنگ نہ لائے۔ میں نے سر جے۔ پی سریواستو سے خواہش کی کہ وہ کانپور جا کر اس قضیہ کو طے کریں۔ ادھر میں نے مسٹر موڈی کو جو اس زمانہ میں کلکٹر کانپور تھے۔ (پھر گورنر سندھ ہوا اور پاکستان میں پنجاب کے گورنر ہوئے) ہدایت کی برٹش مالکان فیکٹری سے مل کر کوشش کریں کہ یہ ہڑتال جلد ختم ہو جائے۔ مزدوروں کی یہ خواہش تھی کہ وہ میرے پاس ڈپوٹیشن لائیں لیکن میں نے

اس سے گریز مناسب سمجھا اور سرجے۔پی سریواستو کو کانپور بھیجا۔ میرا خیال یہ تھا کہ اگر شروع ہی سے گورنر کی مداخلت ہو گی تو پھر من سمجھوتہ نہ ہو پائے گا اور صنعتی ترقی کے واسطے خاصکر ہندوستان میں جہاں ابھی ابتدائی منازل طے ہو رہے ہیں یہ بہت ضروری ہے کہ سرمایہ دار اور مزدور میں کامل تعاون ہو۔ میں نے سرجے۔پی سری واستو پر بہت زور دیا کہ جس طرح ہو اپنی مل کی ہڑتال کو ختم کرا دیں اور برٹش مالکان فیکٹری پر مسٹر موڈی کے ذریعہ سے زور ڈالا گیا۔ یہ ہڑتال جلد ہی ختم ہو گئی۔

میری اب بھی یہ رائے ہے کہ ایسے معاملات میں حکومت کی مداخلت بالکل آخری چیز ہونی چاہیئے ورنہ لوگوں کی امیدیں بڑھ جاتی ہیں۔ ہر فریق اپنے مطالبہ پر اڑتا ہے اور دشواریاں کچھ بڑھ ہی جاتی ہیں پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جب معاملہ حکومت کے سامنے پیش کرنا ہے تو زیادہ سے زیادہ کیوں نہ مطالبہ پیش کیا جائے۔ جب دونوں جانب سے یہ صورت ہو تو کاربراری ناممکن نہیں تو بڑی حد تک دشوار اور ناقابل اطمینان ہو جاتی ہے البتہ جب کوئی اور طریقہ کارگر نہ ہو پھر حکومت آخری فیصلہ کر سکتی ہے۔

مہاتما جی کا روزہ

مئی کے مہینہ میں مہاتما جی نے روزہ رکھا۔ افطار کب ہو گا اس کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ گو اس روزہ کا سبب یو۔پی کی حکومت کا کوئی فعل نہ تھا لیکن مجھے اس کی بڑی تشویش تھی کہ خدانخواستہ روزہ کا انجام بخیر نہ ہوا تو کیا ہو گا۔ اس روزہ کے خاتمہ کی خبر میں نے بڑی مسرت سے سنی۔ مہاتما جی کے ہر فعل یا ترکِ فعل کا اثر ملک پر بڑی تیزی اور موثر انداز سے ہوتا ہے ہم سب جتنے خلوص اور اعتماد سے مہاتما جی کے اصولوں کا احترام اور اس کی پیروی انگریزی ہمارے میں کرتے تھے اب نہیں کرتے۔ یہ بات تعجب کی اتنی نہیں ہے جتنی افسوس کی۔ مگر انسانی فطرت کا یہ خاصہ بھی ہے کہ معالج کے احکام کی پابندی جس تندہی سے بیماری میں کی جاتی ہے صحت میں نہیں کی جاتی۔ یہ مثال یہاں پورے طور پر صادق نہیں آتی لیکن انسانی فطرت کا میلان وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

مقابلہ کے امتحان کا ایک لطیفہ

اس سال یو۔پی سول سروس کے مقابلہ کا امتحان ہوا۔ حکومت کی طرف سے یہ اعلان حسب سابق کیا گیا کہ دو ہندو اور ایک مسلمان لیا جائے گا۔ لیکن جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو حسب ذیل فہرست سامنے آئی۔

(1)	Riazul Hasan :	Marks	809	(out of 1200)
(2)	Musarrat Hussain :	„	787	„
(3)	Jagat Narain Raina :	„	754	„
(4)	Chatur Bihari Lal Dube :	„	748	„

صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد یو۔پی گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ نمبر ۱۔۳۔۴ کو لیا جائے۔ نمبر ۲ کو قدرتاً اس سے مایوسی ہوئی۔ نمبر ۲ مسرت حسین نے ایک خط اپنے پرنسپل مسٹر ہولینڈ کو لکھا جو آگرہ کالج کے پرنسپل تھے اور اس زمانے میں ولایت گئے ہوئے تھے۔ مسٹر ہولینڈ نے اس لڑکے کا خط معہ اپنی سفارش کے سر مالکم ہیلی کو بھیجا اور اس طرح یہ خط میرے پاس پہونچا۔ سر مالکم نے اس طرف توجہ دلائی کہ اگر ممکن ہو تو اس لڑکے کو تائندہ کے لئے نامزد کر لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

خطابات

انسانی نظر میں چیزوں کی قدر و قیمت بدلتی رہتی ہے۔ برٹش حکومت میں خطابات کی بڑی قدر تھی اب ان کی کوئی وقعت نہیں۔

میں نے ۷ ار جون کے خط میں سر مالکم ہیلی سے سفارش کی تھی کہ ہز ہائی نس بنارس کو ملنے سے ہز ہائی نس رام پور گلہ مند ہیں۔ چونکہ میری سفارش رام پور کے متعلق کامیاب نہیں ہوئی۔ میں نے

خواہش کی کہ سرمالکم واپسی پر پھر اس کی تحریک کریں۔ اسی طرح میں نے جے پی سریواستو کے متعلق لکھا کہ انھیں
کے۔ٹی نہیں ملا۔ "لیڈر" اخبار نے ایک نوٹ بھی لکھا کہ ان کے ماتحت مسٹر کنزی کو ملا لیکن
انھیں نہیں ملا۔ جس کو جے۔پی سریواستو محسوس کرتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں
خطابات کی روایت قائم رکھنا چاہیے۔ ایمانداری اور جانفشانی سے کام کرنا ہر شخص کا فرض ہے لیکن انسانوں
کی دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو فرض کا پورا کر دینا ہی اپنا انعام سمجھتے ہوں اور کسی نہ کسی امتیاز کے خواہشمند
نہ ہوں۔

بنارس یونیورسٹی

جن دنوں ویسرائے میرے ہاں مہمان تھے۔ منجملہ دوسری باتوں کے وہ کہنے لگے کہ اُن کے پاس
اس کی شکایت پہونچی تھی کہ بنارس یونیورسٹی کے طلباء میں ڈسپلن نہیں ہے اور وہ بغیر کسی روک ٹوک کے شہر آکر
نامناسب صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یا تو کوئی کمیشن مقرر کیا جائے یا مقررہ سرکاری
امداد پر نظر ثانی کی جائے۔ میں نے کہا کہ جب کوئی بڑا قدم اٹھایا جائے اور سنگین تدابیر اختیار کرنا مقصود ہو
تو پھر کیس کو پورے طور پر مضبوط ہونا چاہیے۔ میں کچھ ایسا خیال کرتا ہوں کہ اول تمام واقعات کی جانچ
ضروری ہے اس کے بعد کوئی رائے قائم کی جائے۔

اس زمانے میں کانپور میں یہ سوال اٹھا کہ گورنمنٹ کے اعلان میں جو ممانعت کی گئی ہے کہ کانپور میں کوئی ہتھیار لے کر نہ نکلے تو اس میں کرپان بھی شامل ہے یا نہیں۔ ایک طرف سکھ صاحبان کہتے تھے کہ سکھ کو ہر وقت کرپان مذہباً رکھنا چاہیئے اور ہر تلوار کو چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو کرپان قرار دیتے تھے۔ دوسرے لوگوں کا بجا طور پر یہ اعتراض تھا کہ جب ایک فرقہ ہتھیار لے کر پھر سکتا ہے تو دوسرے کو منع کرنا قرین انصاف نہیں۔ آج تو ہمارے سکھ بھائی بغیر تلوار کے ہر جگہ نظر آتے ہیں مگر اس زمانے میں اس پر بہت اصرار تھا۔ میں نے پنجاب گورنمنٹ سے دریافت حال کیا اور ایک دوسرا اعلان جاری کیا کہ سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں جس کا سائز نو انچ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس طرح یہ قصہ طے ہوا۔ میرے خیال میں تلوار اور برچھے پر لیسنس کی ضرورت ہی نہیں ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ان ہتھیاروں سے لیسنس کی قید ہٹائی گئی تھی۔ البتہ بندوق اور پستول پر اس طرح کی قید ضروری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بارود والے ہتھیاروں کی اجازت دینے میں غیر محتاط ہونا خطرے سے خالی نہیں۔

ایک دوسرے قصہ کی طرف ہندو مہا سبھا نے توجہ دلائی۔ بریلی میں پولیس کی پریڈ تھی۔ ایک تھانیدار تلک اور قشقہ لگا کر پریڈ پر آئے۔ مسٹر حبیب ہن سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انھوں نے قشقہ چھڑانے پر اصرار کیا۔ اس پر تھانیدار نے استعفیٰ بھیج دیا اور ایس۔ پی نے منظور کر لیا۔ مجھے اس کا علم ہوا تو گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ اگر تھانیدار راضی ہو تو اس کا دوبارہ تقرر کیا جا سکتا ہے۔ گورنمنٹ نے انسپکٹر جنرل سے بھی کہا کہ یہ ایس۔ پی کی غلطی تھی۔ دراصل ہر دو جانب غلطی کی گئی تھی۔ تھانیدار کا ایک نئی بات کرنا جو اس سے پہلے نہ اس نے کی تھی نہ کسی اور نے کی خود ایک چھیڑ تھی۔ وہ باوردی ایک پریڈ کے میدان میں تھا جہاں نہ کوئی برادری کا اجتماع تھا نہ کوئی قومی یا مذہبی تقریب۔ پھر ایس۔ پی کا اس پر توجہ دینا اس کے تدبر کی کمی بلکہ فقدان کی دلیل ہے۔ بہرحال یہ قصہ آسانی سے

ختم ہو گیا۔ لیکن اس میں فتنہ پیدا ہونے کا امکان تھا۔

کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ کے تعلقات

گورنمنٹ ہاؤس میں حسب معمول کمشنروں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں اکثر کمشنروں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اکثر اضلاع میں کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کے باہمی تعلقات اتنے ہموار اور خوشگوار نہیں ہیں جتنے کہ ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال انتظام ضلع کے حق میں مضرت سے خالی نہ تھی۔ کلکٹر اور ایس۔پی دونوں ضلع کے امن چین کے ذمہ دار ہیں۔ اگر خود ان میں اتحادِ عمل نہیں تو ضلع کے امن و امان پر اس کا بُرا اثر ہونا لازمی ہے۔ ان کے تعلقات میں نزاکت کی وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری طور پر اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں۔ ایس۔پی کلکٹر کا ماتحت نہیں ہے جس طرح ڈپٹی کلکٹر ماتحت ہیں۔ وہ ضلع کے امن و امان کے قیام میں کلکٹر کا شریک کار اور دستِ راست ہے۔ ان کے تعلقات چھوٹے اور بڑے بھائی یا جونیر اور سینیر حصہ دار جیسے ہونے چاہئیں اور یہی وجہ دشواری ہے۔ افسر و ماتحت کے تعلقات کی تفصیل و تصریح آسان ہے لیکن حصہ دار کے تعلقات کی تصریح مشکل ہے۔ بہر حال میں متفکر تھا کہ ایک واقعہ میرے سامنے آیا۔

ضلع سہارن پور میں ایک شخص کا چالان ناجائز ہتھیار رکھنے کے سلسلہ میں کیا گیا۔ جب ڈپٹی کلکٹر کی عدالت میں یہ پیش ہوا اُس نے اس مقدمہ کو ایک آنریری مجسٹریٹ کے سپرد کیا۔ آنریری مجسٹریٹ نے بہت کم سزا دی یہ مسئلہ ہوم ممبر کی حیثیت سے میرے سامنے آیا۔ سزا کا کم و بیش ہونا تو عدالت کا ایسا فعل ہے جس پر نہ حکومت جواب طلب کر سکتی تھی نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن میں نے فائل پر یہ لکھا کہ تنخواہ یاب ملازم مجسٹریٹ کی یہ غلطی تھی کہ اس نے اس مقدمہ کو ایک آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں منتقل کیا۔ کمشنر نے مجسٹریٹ سے پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ پولیس کے انسپکٹر نے جو مقدمہ کا ذمہ دار تھا اس پر احتجاج کیوں نہیں کیا کہ ایسا اہم مقدمہ ایک آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں نہ جائے۔ کلکٹر ضلع نے اس خط کی نقل ایس۔پی کو روانہ کی۔ ایس۔پی نے ایک سخت

خط کلکٹر کو لکھا کہ اگر ڈپٹی کلکٹر کی غلطی ہے تو کورٹ انسپکٹر سے کیوں جواب طلب کیا جاتا ہے۔ کمشنر نے یہ خط وکتابت گورنمنٹ کو بھیجی۔ کیبنٹ میں ہوم ممبر اور فنانس ممبر دونوں نے اتفاق کیا کہ ایسی صورت حال بہت غلط ہے۔ گورنمنٹ نے کمشنر اور کلکٹر کی تائید کی اور انسپکٹر جنرل کو بھی مطلع کیا تاکہ وہ اپنے پولیس کپتانوں کو اس سے مطلع کر دے۔ چنانچہ مسٹر فیلڈ ایس پی نے اپنی غلطی کا اعتراف ایک خط میں کیا۔

ٹینس ٹورنامنٹ

میں ہمیشہ نینی تال کے ٹینس ٹورنامنٹ میں شامل ہوا کرتا تھا۔ اس سال بھی میرا دل چاہا کہ حسب عادت شریک ہوں لیکن یہ ذرا سی بات بھی فسانہ بن گئی۔ بعض لوگوں کو اس سے اختلاف تھا۔ جن میں میرے فنانس ممبر سر اڈورڈ بلنٹ شامل تھے۔ ان کے نزدیک گورنر کے لئے یہ مناسب نہ تھا۔ ہوم ممبر سر جگدیش پرشاد اور جنرل میکملن (انچارج ایسٹ کمانڈ) کہتے تھے کہ ضرور کھیلنا چاہیئے۔ چونکہ خود میرا دل بھی یہی چاہتا تھا۔ لہذا میں کھیلا۔ میرے ساتھی راجہ صاحب پیلی بھیت کے بھائی منو تھے۔ یہ بہت اچھا کھیلتے تھے۔ فائنل میچ ہمارا احمد حسین اور اسلام احمد صاحبان کے خلاف ہوا۔ ہم لوگ ۶-۴ اور ۶-۴ کے اسکور سے جیتے۔

سر مالکم ہیلی کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ اگست کے آخر تک واپس ہوں گے۔ میں نے گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن ۱۶ اگست کا ان کا خط آیا جس میں انھوں نے لکھا کہ بادل ناخواستہ انھوں نے وزیر ہند کی اس خواہش کو منظور کر لیا اور وہ اکتوبر تک نہ آسکیں گے۔ اس خط میں سر مالکم ہیلی نے حسب ذیل عبارت لکھی۔

"I am staying on, however, with less reluctance, because I am quite sure, (If you will allow me to say so) that the Province is quite safe in your hands and all have every confidence in your judgement."

برساتی دورہ

میں ۲۵ جولائی کو برساتی دورہ پر نکلا۔ یہ ایک بہت ہی مختصر دورہ تھا۔ بریلی ہوتا ہوا ایٹہ مظفر نگر اور علی گڑھ گیا۔ دورے کا پروگرام اپنی یکسانیت کے لحاظ سے بےمثل ہوتا ہے یعنی اب تک اتنا یکسانیت ہے۔ لیکن ہے یہ ضروری چیز۔ مختلف حضرات سے ملنا۔ اُن کی زبان سے ان کے خیالات ضروریات اور تکالیف کا التفات اور ہمدردی سے سننا یقیناً مفید ہے۔ لوگ ملاقاتوں میں بعض باتیں مجھ سے اتنی صفائی سے بیان کر دیتے تھے کہ اُن کا یہ اعتماد کبھی کبھی میرے واسطے خلجان کا باعث بن جاتا۔ میرا عمر بھر کا یہ اصول رہا ہے کہ اگر کوئی بات رازداری کے طور پر مجھ سے کہی جائے تو میں اس راز کو کبھی آشکارا نہ کروں گا۔ ذاتی معاملات میں مجھے اس سے کچھ پریشانی نہیں ہوتی۔ ایسی اکثر مثالیں ہیں کہ لوگوں نے میرے ہاں غبن کیا اور اقرارِ جرم کی تحریر مجھے دیدی یا زبانی اقرار کر لیا۔ مثلاً اسی زمانہ میں ایک غبن کا مقدمہ میرے کوٹھاری مسمی بہاری کے خلاف چل رہا ہے۔ اُس نے میرے اور لالہ کا متا پرشاد کے سامنے سولہ ہزار کے غبن کا اقرار کیا۔ لیکن میں نے لالہ کامتا پرشاد کو جو اسی مقدمہ میں بحیثیت مختار عام مدعی ہیں۔ اس کی اجازت نہیں دی کہ اس اقرار سے کوئی نفع اٹھایا جائے۔ لیکن سرکاری معاملات میں ایسا اقرار میرے ضمیر میں کشمکش پیدا کرتا تھا اور ایسے مواقع میرے لئے سخت آزمائش کے ہوتے تھے۔

ایٹہ

۲۶ جولائی کو میں ایٹہ گیا اور راجہ صاحب اواگڑھ کی کوٹھی میں مقیم ہوا۔ حسب دستور ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ اور ریفورم لیگ نے ایڈریس دئے۔ ان کے جواب دئے۔ لنچ۔ ایٹ ہوم اور ڈنر ہوا۔ دوسرے روز مسٹر سیلٹر کا مرغیوں اور بکریوں کا فارم دیکھا۔ بہت اچھی مرغیاں اور بکریاں تھیں۔ یہاں

خواتین کے ایک کلب کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔

مظفر نگر

۲۸ر جولائی۔ایٹہ سے مظفر نگر پہونچا۔ وہی ایڈریس اور ملاقاتیں۔ مظفر نگر میں مختلف اداروں کو بھی دیکھا۔ مثلاً سعادت بورڈنگ ہوس۔ لالہ بھلا رام کا شفاخانہ۔ سناتن دھرم ہوسٹل کا افتتاح کیا زمیندار ایسوسی ایشن نے "ایک ایٹ ہوم" دیا۔

علی گڑھ

۲۹ر جولائی۔ یوں تو میرے دورے میں عوام کا مجمع ہر جگہ بڑی کثرت سے ہوتا تھا لیکن علی گڑھ میرا گھر تھا۔ یہاں مجمع بہت ہی زیادہ تھا۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں مرحوم و مغفور نے اس پر اصرار فرمایا کہ میں مزمل منزل میں اُن کے پاس قیام کروں۔ میں نے اس وجہ سے کہ میرا گھر بھی موجود تھا معذرت چاہی۔ مگر نواب صاحب مرحوم کے بزرگانہ اصرار پر میرا قیام مزمل منزل ہی میں ہوا۔ کرسٹن ویٹ ہال میں ڈسٹرکٹ بورڈ۔ میونسپل بورڈ۔ سولجرس بورڈ، زمیندار ایسوسی ایشن کے ایڈریس پیش ہوئے۔ شام کو زمیندار اور شہر کے دوسرے عمائدین کی جانب سے ایٹ ہوم ہوا۔ شب کو خان بہادر عبید الرحمٰن خاں صاحب کے گھر ڈنر تھا۔

۳۰ر جولائی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنے چچا نواب بہادر عبد الصمد خاں مرحوم مغفور کے سلام کی غرض سے طالب نگر گیا۔ میرے چچا یہیں رہتے تھے۔ یہ اُس زمانے میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ جیسا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ میرا بچپن ان کی گود میں گذرا۔ انھیں مجھ سے اور مجھے ان سے بڑا اُنس تھا میں قدمبوس ہوا تو وہ آبدیدہ ہو گئے۔ پھر اپنی چچی صاحبہ کے سلام کو حاضر ہوا۔ اب نہ وہ زندہ ہیں اور نہ طالب نگر ہی وہ طالب نگر ہے لیکن ان کی یاد اس طرح تازہ ہے جیسے گردشِ روزگار نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

شام کو چھتاری گیا۔ وہاں راؤ اصغر علی خاں مرحوم نے "ایٹ ہوم" دیا تھا۔ تمام چھتاری کے معززین اور ملازمین مدعو تھے۔ آج جب یہ لکھ رہا ہوں راؤ اصغر علی خاں بھی جنّت کو سدھار چکے ہیں۔ مگر ناشکری ہوگی اگر اس کا اعتراف نہ کروں کہ ایسے مخلص اور باوضع لوگ شاید میرے لئے مفقود ہیں۔ میرے ساتھ جیسی پُرخلوص دوستی تادمِ آخر مرحوم نے نبھائی اُس کی مثالیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

شام کو نواب سر مزمل اللہ خاں نے ایک بڑا پُرتکلف ڈنر دیا۔ جس کے بعد میں اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ۳۱ جولائی کو نینی تال پہونچا۔

سر شاہ سلیمان مرحوم

اسی سال ستمبر کے مہینہ میں سر شاہ سلیمان مرحوم گورنمنٹ ہاؤس میں میرے مہمان ہوئے۔ یہ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ عجیب کردار۔ صفات اور قابلیت کا اجتماع اُن کی ذات میں پایا جاتا تھا۔ اپنے زمانے کے ہندوستان کے ممتاز ترین شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں اس درجہ ہمہ جہت قابلیت کسی ایک شخص میں نہیں پائی۔ قانون کے میدان میں ان کی فضیلت محتاج بیان نہیں۔ بار سے اُٹھ کر چیف جسٹس ہوئے۔ اس کے بعد دہلی سپریم کورٹ کے جج ہوئے۔ ریاضی میں مرحوم نے ایک مقالہ لکھا تھا جو عرصہ تک دنیا کے ماہرین ریاضی کے زیر بحث رہا۔ کچھ عرصہ کے لئے اپنے سرکاری فرائض کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری بھی اعزازی طور پر قبول کر لی تھی۔ ہر ہفتہ دو روز کو دہلی سے اپنے خرچ سے آتے تھے۔ وکٹوریہ گیٹ کے اوپر کمرے میں ٹھہرتے اور دارالعلوم کی خدمت انجام دیتے۔ دارالعلوم کی خدمت کیسی انجام دی اس کے جواب میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اُن کے زمانے میں علی گڑھ کے طلباء نے مقابلہ کے امتحانوں میں جس قدر کامیابی حاصل کی اس قدر نہ اس سے پہلے حاصل کی گئی اور نہ اُن کے زمانہ کے بعد حاصل ہو سکی۔

۱۵ اکتوبر کو علی الصباح میں نینی تال سے "موہن" ڈاک بنگلہ کے لئے روانہ ہوا۔ میجر جم کاربٹ

ساتھ تھے۔ یہ بنگلہ جنگلات کا بنگلہ تھا اور میجر کاربٹ نے میرے واسطے شکار کا انتظام یہیں کیا تھا۔ میں اس شکار کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ میجر کاربٹ نینی تال میں بڑی جائداد کے مالک تھے۔ بہت ہی نیک منکسر مزاج شخص ہیں اب ہندوستان کو چھوڑ کر کینیا (افریقہ) میں آباد ہیں۔ کبھی اپنے شکار کے حیرت انگیز کارنامے خود بیان نہیں کرتے اسی شکار میں میجر کاربٹ نے ایک شیرنی کو جو بولتی ہوئی پہاڑ کی طرف جا رہی تھی۔ میری موجودگی میں شیر کی آواز اپنے گلے سے نکال کر اسے واپس بلایا۔ میجر کاربٹ فقط مردم خور شیروں کو مارتے تھے۔ ورنہ سنیما کے فوٹو لیا کرتے تھے۔ انھیں جانوروں کی حفاظت کا بڑا شوق تھا۔ ان کی رائے سے اکثر قوانین جانوروں کی تحفظ نسل کے واسطے بنائے گئے۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ بندوق بہت اچھی چلاتے تھے۔ اسی شکار میں انھوں نے مجھے ایک قصہ سنایا۔

کمایوں میں ایک شیر مردم خور ہو گیا۔ یہ اس کی تلاش میں نکلے۔ لیکن باوجود کئی شیر مارے جانے کے یہ موذی بچ جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک روز وہ اس کی تلاش میں سرگرداں تھے اور ایک خشک پہاڑی نالہ سے اتر رہے تھے۔ رائفل پاس تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ چند گز کے فاصلہ پر ایک شیر داؤ کرتا ہوا آرہا ہے۔ جوں ہی انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔ شیر رک گیا۔ وہ اس کا منتظر تھا کہ ان کی نگاہ کسی طرف کو پھرے اور وہ جست کرے۔ میجر کاربٹ نے آہستہ آہستہ بندوق کاندھے سے ہٹا کر نشانہ لگایا۔ یہ شیر جس طرح بیٹھا تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ آہٹ پاکر وہ پلٹ پڑے اور شیر کے مقابل ہو گئے۔ یہ شیر کی عادت ہے کہ وہ ایسی صورت میں رک جاتا ہے۔ انھیں گولی چلانے کا موقع مل گیا۔ اگر دو تین سکنڈ یہ متوجہ نہ ہوتے تو شکاری خود شکار ہو جاتا۔

بارش کی وجہ سے شکار کچھ اچھا نہ ہوا۔ کوئی شیر نہ ملا۔ البتہ مور۔ مرغ۔ چیتل۔ کاکڑ کا شکار خاصہ اچھا ہوا۔

۲۴ اکتوبر کو میں رام نگر کے اسٹیشن سے سوار ہوا۔ مجھے جنگل چھوڑنے کا ہمیشہ افسوس ہوتا ہے۔ ۲۵ کو لکھنؤ پہونچا۔

آگرہ یونیورسٹی

آگرہ یونیورسٹی کا ۴ نومبر کو کانووکیشن تھا اور وائس چانسلر صاحب کی یہ خواہش تھی کہ میں بحیثیت چانسلر اس کی صدارت کروں اور یونیورسٹی کی موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھوں۔ میں ۴ نومبر کو آگرہ گیا۔ کانووکیشن ایڈریس تو وائس چانسلر صاحب نے خود دیا تھا۔ میں نے چند جملے غیر سرکاری طور پر کہے تھے۔ وہ سماں میری آنکھوں میں آج تک محفوظ ہے اور وہ جذبات میری یاد میں اب تک تازہ ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا کتنا بڑا اور کیسا جیتا جاگتا مجمع میرے سامنے تھا۔ ان سے میری کیا توقعات تھیں اور اس موقع پر میرے کیا تاثرات تھے۔ میری تقریر کے ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ گذشتہ بیس سال میں وہ امیدیں پوری ہو سکیں یا نہیں۔ اس کا جواب ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کی ہندوستان کی تاریخ دے گی۔ صرف اتنا کہہ دینا میرے لئے کافی ہے کہ مستقبل کے متعلق وہ پرجوش امنگیں کہ جو اس روز میرے قلب میں موجزن تھیں آج نہیں پاتا۔

Finally, I should like to say a few words to those on whom a degree has been conferred this after-noon. What I wish to impress upon you is that we of the older generation look upon you to fulfill our hopes and expectations and to achieve success where we have failed. Please do not think that today's function is the end. No, it is really the beginning of your career. You have vast opportunities before you of serving your motherland; you are destined to play a great part in future India, an India which I hope will be one day mistress of her own destinies. Your Vice-Chancellor has spoken many words of advice to you in regard to your future, I do not wish to inflict

any more advice on you. But I have a confession to make—a confession on behalf of the old generation, namely, that we have failed to destroy the communal poison and we look upon you to do so. Will you? To those whose hearts say "Yes" to my question I would say this—you can destroy it not by what you preach but by your action. Treat every Indian as a brother Indian, irrespective of his caste, creed or religion. Select your friends on their personal me rits and not because they happen to belong to particular religion. Do this, and I feel sure that you will succeed in creating a united nation of Indian people.

میں نے اسی روز یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد بھی رکھا۔ اس تقریر میں میں نے مسٹر کینن ڈیوس اور مسٹر کچلو اسچھانی کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ان حضرات نے معقول رقمیں یونیورسٹی کو دی تھیں

مسٹر کینن ڈیوس نے تو عمر کا بڑا حصّہ آگرہ کی نذر کیا۔ یہ آگرہ کالج کے پرنسپل تھے اور جب یونیورسٹی بنی تو اس کے پہلے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ اپنی عمر بھر کے اندوختہ کا ایک حصّہ یونیورسٹی کے نذر کردیا۔ ایسے ایثار کی مثالیں بہت کم یاب ہیں۔

الہ آباد

میں آگرہ سے الہ آباد گیا اور ایک ہفتہ تک مقیم رہا۔ سر تیج بہادر سپرو نے بہت بڑے پیمانے پر "ایٹ ہوم" دیا۔ اور دورانِ ملاقات میں بہت سی ایسی باتیں کہیں جس سے میری ہمت افزائی ہوئی۔ مجھے سر تیج سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ بڑی اعلیٰ سیرت اور بلند کردار کے حامل تھے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں

مگر اس صوبہ میں ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوگیا وہ پُر نہ ہو سکا۔ زمیندار ایسوسی ایشن الہ آباد نے ایک ایڈریس اور "ایٹ ہوم" دیا۔ میں نے گورنمنٹ ہاؤس میں ڈنر اور لنچ دئے۔ ایک مختصر دربار بھی منعقد کیا گیا جس میں ان لوگوں کو تمغے دئے گئے تھے۔ اس کے بعد ایک "ایٹ ہوم" ہوا۔

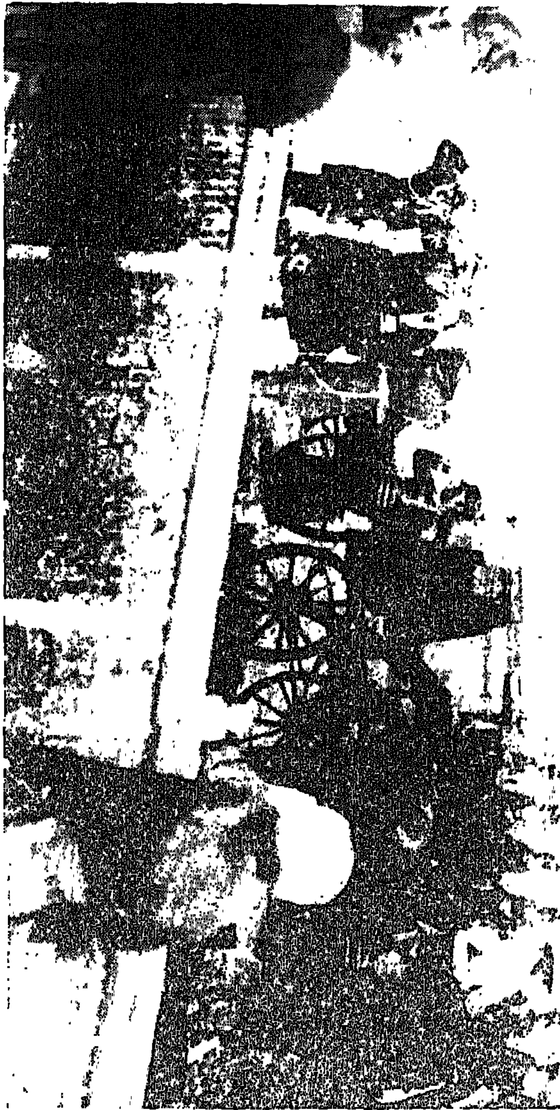
دارالعلوم علی گڑھ کی طرف سے سرفرازی

سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے مجھے لکھا کہ دارالعلوم کے ارباب حل عقد نے یہ طے کیا ہے کہ مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا جائے۔

میں ۱۳ ار نومبر کو علی گڑھ آیا۔ مجھے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ جس دارالعلوم کے آغوش میں میری ذہنی، دماغی اور جسمانی نشو ونما ہوئی جس کی چہار دیواری میں میرا پُر مسرت زمانہ میرا لڑکپن گزرا۔ جہاں کی زمین کا ہر ہر گوشہ۔ درخت۔ درو دیوار میرے دل میں کسی نہ کسی دل چسپ واقعہ کی یاد تازہ کرتے تھے اُس دارالعلوم کی طرف سے سرفرازی میرے واسطے کس قدر باعثِ فخر و مسرت تھی۔

یہاں کا پروگرام بالکل وہی تھا جو ہر ایسے موقعہ پر ہوتا ہے۔ اسٹیشن پر استقبال جس میں دارالعلوم کے ارباب حل و عقد کے علاوہ حکام ضلع اور رؤسا علی گڑھ بھی شریک تھے۔ میرا قیام اس بار وائس چانسلر کے ہاں تھا اور میرا اسٹاف شاید راحت منزل میں ٹھہرا تھا۔

اسپیشل کانووکیشن کا پروگرام بھی حسب دستور تھا۔ کتب خانہ میں اجتماع پھر اسٹریچی ہال تک جلوس۔ پھر کانووکیشن۔ میرے لئے وہ دن بڑی خوشی کا روز تھا۔ اپنے دارالعلوم سے اعزازی ڈگری "ڈاکٹر آف لا" کی پانا بڑی سرفرازی تھی۔ لڑکوں میں غیر معمولی جوش تھا جس کا اظہار سہ پہر کے "ایٹ ہوم" میں بہت ہی واضح طور پر ہوا۔ کانووکیشن میں تو پابندی رسوم و قواعد ایک حد تک مانع تھی لیکن "ایٹ ہوم" دوسری چیز ہے۔ جوں ہی میں چائے نوشی کے بعد مہمانوں سے ملنے کے واسطے آگے بڑھا۔ طلبا نے بڑھ کر گھیر لیا۔ میرا اے۔ ڈی سی اور اسٹاف مجھ سے الگ ہوگیا۔ کیسی شادمانی اور کیسی محبت طلبا کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں نے پندرہ ہزار روپیہ کا حقیر مگر پُر خلوص پیش کش دارالعلوم کو پیش



کیا۔

شب کو میرے چچازاد بھائی خان بہادر عبدالجلیل خاں صاحب نے ایک پُر تکلف اور شاندار دعوت کی۔ ڈنر کے بعد میں سلون میں سوار ہوگیا۔

میرے تاثرات

علی گڑھ دارالعلوم میں آنا کسی اور جگہ جانے سے بالکل مختلف تھا۔ اُن تاثرات کا اتنے برس بعد لکھنا مشکل ہے۔ مگر میری تقریر کے چند فقرات میرے اُن محسوسات کی تھوڑی سی بہت ترجمانی کر سکتے ہیں۔

Those who have known the feelings of a son being welcomed back home can best appreciate my sentiments today at the reception that has been accorded to me by my Alma Matre. Today I am allowed to live again the years gone by when I was like many of you, a boy, without the prefix "Old"; when I was as you are now, a care-free happy son of this Institution. My memory is crowded canvas, full of pictures of pleasant associations, of staunch and loyal friendships, of happy gatherings in this very hall, and of impressive and awe-inspiring occasions like the annual examinations.

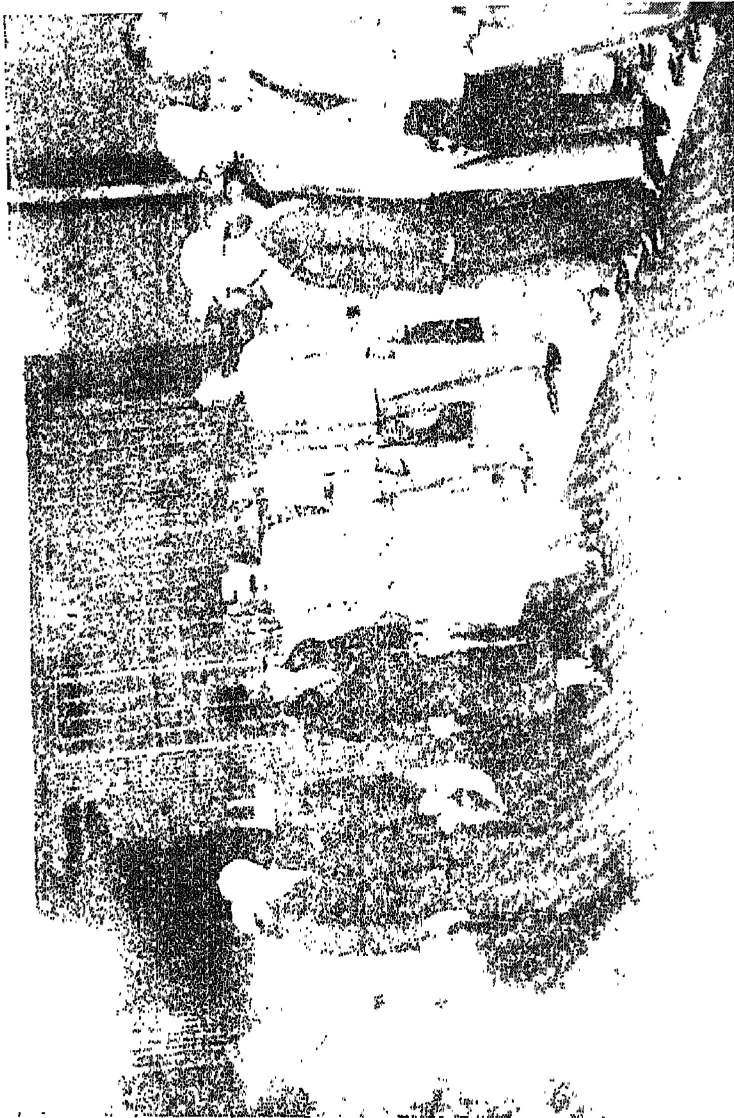
سر مالکم ہیلی کی واپسی

میں لکھنؤ آگیا۔ خیال یہ تھا کہ سر مالکم ہیلی غالباً وسط نومبر تک آجائیں گے لیکن راستہ میں دھولپور یا کسی اور ریاست میں کچھ روز کو ٹھہر گئے۔ ۲۷ر نومبر اُن کے آنے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اُسی زمانے میں سالانہ گھوڑ دوڑ کا ہفتہ بھی آگیا۔ میرے یہاں بہت سے مہمان مدعو تھے۔ گھوڑ دوڑ ہفتہ کی چہل پہل شروع

ہوگئی۔ ایک روز مقرر تھا جب گورنر سرکاری طور پر گھوڑ دوڑ میں جاتے تھے۔ چوکڑی میں گورنر ہوتے تھے۔ اُن کے گرد وپیش فوجی رسالہ کے سوار ہوتے تھے۔ اس طرح گھوڑ دوڑ کے میدان میں گورنر پہونچتا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مجھے گھوڑ دوڑ سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ لوگوں سے مل کر واپس آگیا
۲۷ نومبر کو سر مالکم ہیلی آگئے۔ میں نے شام کو چارج دیا۔ شب میں انھوں نے مجھے ایک ڈنر دیا جس میں تقریباً ساٹھ پینسٹھ آدمی تھے۔ میرا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے بہت اچھے الفاظ میرے اور میرے انتظام کے متعلق استعمال کئے۔ جن کا میں نے مناسب الفاظ میں جواب دیا۔

دوسرے روز میں ایک شب کے لئے سر جگدیش پرشاد کے گھر چلا آیا جس کی صبح کو میں چھتاری کے لئے روانہ ہوگیا۔ سر مالکم نے اسٹیشن پر خاص اہتمام کیا تھا۔ وہ معہ لیڈی مالکم ممبرانِ گورنمنٹ۔ سکریٹریز اور نظار (ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ) کے اسٹیشن پر موجود تھے۔ علاوہ اس کے بہت بڑی تعداد غیر سرکاری حضرات کی اسٹیشن پر موجود تھی۔ نو بجے سب سے رخصت ہوکر میں سلون میں سوار ہوگیا۔ چھتاری پہونچکر میں نے رضا مرحوم کو غیر معمولی طور پر افسردہ پایا۔ تھوڑی دیر تک میں نے ان سے مذاق اور محبت کی گفتگو کی اور وہ بہل گئے

تقریباً گیارہ سالہ سرکاری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جہاں کچھ اچھے کام ہو سکے وہاں بہت سے اچھے ارادے عملی جامہ نہ پہن سکے۔ جب کوئی شخص کسی نئی وادی میں قدم رکھتا ہے تو طرح طرح کے منصوبے اُس کے ذہن میں ہوتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو خلاف امید گوشوں سے سوال رونما ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی اہم ہوتی ہیں کہ اگر انھیں نظر انداز کر دیا جائے تو اصلاح سے حصولِ مقصد نہیں ہوتا۔ پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وقت پر اصلاحی کارروائی نہ کرنا اتنا ہی مضر ہوتا ہے جتنا قبل از وقت اصلاح شور و فتن کے باعث بن جاتی ہے۔ اس کی مثالیں خود ہندوستان میں اور ملک کے باہر موجود ہیں۔ امان اللہ خاں کا تاج و تخت چھوڑنا ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ گذشتہ زمانے میں ہندو کوڈ بل کی مخالفت اندرون ملک کی ایک مثال ہے۔ پھر اس زمانے میں برٹش گورنمنٹ کا نقطۂ نظر بہت سی باتوں میں اہلِ ملک کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا اور بنیادی پالیسی برطانوی حکومت کے ہی ہاتھ میں تھی۔ تاہم بہت سی اصلاحات ہوئیں۔ مثلاً جیل میں قیدیوں میں اے۔ بی۔ سی درجوں کا قائم ہونا



کاشتکاروں کو اپنی زمین پر حقوق حین حیاتی اور پانچ سال تک اُس کے بعد ملنا۔ مناسب لگان کا استقرار۔ سودیشی چیزوں کی ترویج کے لئے محکمہ قائم ہونا۔ جب اشیاء کی قیمتیں گریں تو لگان کی کمی۔ قرضوں کی تعداد رقم کی کمی۔ حفظان امن سنگین جرائم میں کمی وغیرہ وغیرہ

اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ بنیادی یا دوررس اصلاحات کی ضرورت تھی جو بروئے کار نہ لائی جا سکیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ بدیشی حکومت ایسی اصلاحات کا بار اپنے سر نہیں لے سکتی تھی جو سماجی طبقات کے توازن کو برہم کردے یا جو لوگوں کے دیرینہ رسم ورواج یا ایسے توہمات کو جو مذہبی رنگ اختیار کر چکے ہوں مٹائے۔ مثلاً چھوت چھات کا سوال ہے۔ شادی اور طلاق کا مسئلہ۔ زمینداری کو ختم کرنے کا قانون وغیرہ وغیرہ۔ وجہ ظاہر ہے کہ بدیشی حکومت کو اہلِ ملک کی تائید کا یقین نہیں ہوتا اس لئے ایسی تجاویز خواہ ملک کے حق میں مفید ہوں یا مضر۔ اگر کسی جماعت کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں تو اُن کو نہ چھیڑنا ہی مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ بہر حال میں اسے مانتا ہوں کہ اُس زمانے کے انتظام حکومت سے متعلق نہ میری رائے غیر جانبدارانہ کہی جا سکتی ہے نہ اُن ناقدین کی جو سیاسی اختلاف سے متاثر تھے اصلی جج تو اس صوبہ کے عوام الناس ہیں۔ اس لئے کہ ہر حکومت کا پہلا فرض ان کی حفاظت اور ان کی خوش حالی ہے۔

اس موقع پر مجھے سرہارکورٹ بٹلر کا ایک فقرہ یاد آرہا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "جب ہم کسی شکارگاہ میں دوبارہ جاتے ہیں تو ہمیں وہ مقامات یاد رہتے ہیں جہاں ہم نے شیر مارا لیکن ساتھ کے شکاریوں کو وہ موقعے یاد رہتے ہیں جہاں کسی ریچھ یا تیندوے پر ہمارا نشانہ خالی گیا۔

بہر حال یہ دَور ختم ہوا اور میرے دل میں اپنے وطن کے ایسے دوستوں کی یاد جنھوں نے میری مدد فرمائی اور میری دشواریوں کو ہمدردانہ نظر سے دیکھا ہمیشہ احسانمندی کے جذبات کے ساتھ تازہ رہے گی۔

حسب دستور اس موقع پر بہت سے خطوط آئے جو میرے لئے موجب تشکر و امتنان ہوئے۔ ان میں سے بعض کے اقتباسات کا اندراج بے موقعہ نہ ہوگا۔

EXTRCT FROM A LETTER OF SIR B.L. MITTER, LAW MEMBER OF COUNCIL, INDIA

New Delhi,
18th November, 1933

"..

The manner in which you have managed your Province has evoked admiration from all sides. You are still young, though wise in experience. I hope after a period of deserved rest, you will find adequate scope for your abilities to the service of the country. I am afraid that at the begining, the new Constitution will bring adventurers at the source, corrupting and debasing public life. The only remedy is organised effort by the stable elements and you are qualified in a peculiar degree to undertake the task, at least in your own Province. It is time our landed aristocracy woke up. ....

...."

With the kindest regards from my wife and myself."

Yours sincerely,
Sd. B. L. Mitter

Personal

19, Albert Road,
Allahabad,
November 24, 1933

My dear Nawab Sahib,

I see from the morning papers that Sir Malcolm Hailey has landed and is on his way to Lucknow. I persume that in another two days you will be laying down the reins of your high office which you have filled with so much distinction and in the midst of such marked

appreciatoin on the part of the community at large. It must be a source of satisfaction and pride to you that the Hindus and Muslims alike have vied with each other in doing honour to you whe■ever you have gone. No doubt your own personal charm of manner accounts to a large extent for your personal popularity but I have no doubt there is simultaneously with that the feeling that you are an Indian. May I, therefore, as an old friend and admirer congratulate you upon the success you have achieved in your official career and express the hope that the closing if this chapter may soon mean the opening of a new chapter of public usefulness. You are no doubt entitled to some rest but I hope that after the short spell of rest, you will renew your public activities. I can conceive nothing nobler being done by you than taking your proper share in the establishment of proper relations between the two communities, without which our politics must, continue to be a chain of attempts at manouvering for position, each community doing what it can to harm the other. I wish you every good luck in your new sphere of life and trust that the future in your case will be still more briliant than the past.

With kindest regards and all good wishes,

His Excellency
Nawab Sir Ahmad Said Khan Buhadur,
KCSI Governor, U. P., Lucknow.

Yours sincerely,
Sd. Tej Bahadur Sapru

سرکاری زندگی کے بعد

پھر شب و روز اسی طرح گذرنے لگے جیسے سنہ ۱۹۲۳ء سے پہلے گذرتے تھے۔ چند مہینے تو میرے بالکل وہی محسوسات تھے جو اس نوجوان طالب علم کے ہوتے ہیں جو تعطیل میں آیا ہو۔ صبح آنکھ کھلتی تو اس خیال سے تفریح ہوتی کہ کوئی ضروری پروگرام جلد تیار ہونے پہ مجبور نہیں کر رہا ہے۔ اب [illegible] نے اپنی ریاست [illegible] خانگی [illegible]

کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلی چیز۔ جو گو میرے علم میں عرصہ سے تھی تخفیف لگان و مال گزاری کا سوال تھا۔ میری
ریاست میں کاشتکاروں پر تخفیف لگان اتنی کی گئی تھی کہ اس سے زیادہ قواعد کے اندر ناممکن تھی اور مال گزاری
کی تخفیف مجھے قواعد کے خلاف کم دی گئی تھی۔ میں چونکہ خود حکومت کا ایک رکن تھا۔ میں نے ایک ایسے قضیہ کو
اٹھانا جو میرے ذاتی مفاد سے متعلق ہو مناسب نہ سمجھا اور خاموش رہا۔ لیکن اب اس مسئلہ کو زیر بحث لانے
میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔

تخفیف مال گزاری اور ادائے مال گزاری کے بعد میرا خالص منافع دو لاکھ پینسٹھ ہزار تھا۔ گورنمنٹ
نے ایک لاکھ چھبیس ہزار کی تخفیف لگان میں کی۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ تخفیف فی صدی شاید
ہی کسی زمیندار کے حصہ میں آئی ہو۔ گورنمنٹ کے قواعد کے مطابق تخفیف فقط اُن کاشتکاروں کو مل سکتی تھی
جو اصلی کاشتکار ہوں۔ میرے شکمی کاشتکاروں کو کوئی تخفیف نہیں دی گئی تھی۔ مگر مجھے اس کا احساس تھا کہ
شکمی کاشتکاروں کو اس کی ضرورت اور بھی زیادہ تھی اس واسطے کہ اُن کے لگان کی شرح زیادہ تھی۔ چنانچہ میں نے
اسی تناسب سے انھیں بھی چھوٹ یا تخفیف لگان منظور کیا۔ اور اس طرح نو ہزار روپے سالانہ میری آمدنی
سے اور گھٹ گئے۔ لیکن لگان میں اتنی کمی کے باوجود مجھے مال گزاری میں فقط سولہ ہزار کی تخفیف دی گئی اس
پر مجھے اعتراض تھا۔

میں نے ایک درخواست تیار کرا کر حکومت کی خدمت میں پیش کی۔ چھان بین شروع ہوئی۔ مسٹر موڈی
(جو بعد میں سر فرینک موڈی اور سندھ اور سندھ اور پنجاب میں گورنر ہوئے) اس زمانے میں بلند شہر کے کلکٹر
تھے جب یہ تخفیف عمل میں آئی تھی۔ جب اُن سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے گورنمنٹ کو اور مجھے ایک نجی خط
میں یہ لکھا کہ مال گزاری میں جتنی تخفیف چھتاری کو ملنی چاہیئے تھی وہ اس وجہ سے نہیں دی جا سکی کہ اُن کے
(موڈی کے) خیال میں دوسرے زمینداروں سے زیادہ ریاست چھتاری بار اٹھا سکتی تھی۔ میں اس جواب کو دیکھ
کر بہت خوش ہوا اس لیے کہ اس جواب میں کوئی منطق نہ تھی اور صریحاً یہ کارروائی خلاف قانون تھی۔ اس کے
چند ہی روز بعد میں نینی تال گیا اور لارڈ ہیلی سے ملا۔ میں نے موڈی صاحب کے خط کی نقل انھیں دکھائی۔ وہ مجھ
سے متفق تھے کہ میرے ساتھ بہت سختی ہوئی۔ میں نے بڑی امیدوں کے ساتھ اس پر زور دیا کہ میری مال گزاری

میں مزید تخفیف دی جائے۔ لارڈ ہیلی نے مباحثہ کا طرز ہی بدل دیا۔ کہنے لگے کہ نواب صاحب میری جگہ اگر آپ خود گورنر ہوتے تو اس معاملہ میں کیا حکم دیتے۔ میں نے اس پر احتجاج کیا کہ یہ سوال نامناسب ہے۔ میں اس وقت گورنر نہیں ہوں گورنر تو آپ ہیں۔ کچھ دیر اس پر ردّ و قدح رہی مگر وہ نہ مانے اور اصرار کرتے رہے۔ میں عجیب دشواری میں تھا۔ فریق کی حیثیت سے انسان بہت کچھ کہہ سکتا ہے لیکن جج کی حیثیت تو بالکل اور ہے۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے کوئی مزید تخفیف مال گذاری میں نہ مل سکی۔ اس لئے کہ میں نے یہ کہا کہ اگر میں گورنر ہوتا تو ساڑھے تین برس بعد اس معاملہ کو پھر زندہ کرنے کی اجازت نہ دیتا۔

اس زمانے کی کوئی ڈائری نہیں ہے۔ لہذا تاریخیں یاد نہیں۔ واقعات میں تقدیم و تاخیر کا امکان ہے۔ جو تصویر حافظہ کے پردے پر آجاتی ہے سپرد قلم کر دیتا ہوں۔

(سر راس مسعود مرحوم کا وائس چانسلری سے استعفیٰ)

سنہ ۱۹۳۴ء میں سر راس مسعود نے علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفا دے دیا۔ قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم اُن سے قبل وائس چانسلر تھے۔ ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال چانسلر تھیں۔ اسی زمانہ میں ذرغالباً چانسلر کی تحریک پر حکومت ہند نے یونیورسٹی کے معاملات کی دیکھ بھال چھان بین کے واسطے ایک کمیٹی بٹھائی۔ سر ابراہیم رحمت اللہ اس کے صدر تھے۔ اس کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے انتظام پر اعتراضات تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو استعفیٰ دینا پڑا اور سر راس مسعود مرحوم اُن کے بجائے وائس چانسلر ہوئے۔ مجھے آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سر راس کے استعفیٰ کی وجہ کیا تھی۔ کورٹ نے نہ صرف اُن کے ساتھ تعاون کیا بلکہ اُن کی اطاعت کی تھی۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو سر راس مسعود نے استعفیٰ دیدیا۔ اب سوال یہ تھا کہ وائس چانسلر کون ہو۔ سر فضل حسین مرحوم نے (جو اُس زمانہ میں گورنمنٹ ہند کے ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر تھے اور یونیورسٹی انھیں کے صیغہ میں تھی) مجھے خط لکھا اور یہ دریافت کیا کہ کیا میں اسے پسند کروں گا کہ مجھے وائس چانسلر بنایا جائے۔ میں نے جواب میں جو عرض کیا وہ الفاظ یہ تھے۔

"I do not think I will be doing any good to the Community or to myself if I accept it."

سر فضل حسین نے میرے ہی الفاظ دہراتے ہوئے میری رائے سے جواب خط میں اتفاق کیا۔
یہاں میں تھوڑی دیر کے لئے اصل کہانی سے ہٹ کر یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس عہدہ کو قبول کرنے پر میں کیوں نہ آمادہ ہوا۔ خدا شاہد ہے کہ مجھے اس دارالعلوم سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ دارالعلوم کی خدمت کسی طرح بھی ہو میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ لیکن ان دنوں کچھ وہاں کی فضا ایسی ہو گئی تھی کہ اطمینان و اعتماد سے کام کرنا دشوار تھا۔ اس کے متعلق سر راس مسعود کے تقرر کے سلسلہ میں پہلی جلد میں میں مختصراً عرض کر چکا ہوں۔

نواب اسمٰعیل خاں صاحب جو ٹریژرر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے عارضی وائس چانسلر ہو گئے اور مستقل وائس چانسلر کی تلاش شروع ہوگئی۔ اُس زمانہ میں ہز ہائی نس نواب سر حمید اللہ خاں والئی ریاست بھوپال چانسلر تھے۔ جہاں تک مجھے خیال ہے وہ نواب اسمٰعیل خاں کی موافقت میں تھے اور سر فضل حسین انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر فضل حسین اس پر زور دینے لگے کہ مجھے وائس چانسلری قبول کر لینی چاہیئے۔ چنانچہ ایک روز دہلی میں میری طلبی ہوئی۔ میں سر فضل حسین مرحوم کے مکان پر پہونچا۔ مرحوم نے اصرار اور میں نے انکار کرنا شروع کیا۔ مرحوم نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے یہ کہا کہ "بھئی اس بوڑھے کو کیوں "let down" کرتے ہو"۔ اُن کا اشارہ لارڈ ولنگڈن کی طرف تھا۔ میں نے سُنی ان سُنی کر دی مرحوم نے دریافت کیا کہ وائسرائے سے کب ملوگے۔ میں نے کہا دو تین روز میں شاید مل سکوں۔ لیکن میں اُن کی کوٹھی سے سیدھا وائسرائے ہاؤس پہنچا اور اے۔ ڈی۔ سی سے خواہش کی کہ وائسرائے سے عرض کریں کہ میں دو منٹ کے لئے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فوراً بلا لیا۔ میں نے سر فضل حسین مرحوم سے جو گفتگو ہوئی تھی مختصراً بیان کی اور اُن سے خواہش کی کہ آپ سے سر فضل حسین کہیں گے لہذا آپ اصرار نہ کریں کہ میں وائس چانسلری قبول کر لوں۔ اُن سے وعدہ لے کر میں چلا آیا۔ لیکن سر فضل حسین مرحوم بڑے دُھن کے پکّے تھے۔ وہ کبھی اپنے ارادہ سے ہٹتے نہ تھے۔ وہ یہ ارادہ کر چکے تھے کہ نواب اسمٰعیل خاں

مستقل وائس چانسلر نہ ہوں۔ اس کے بعد بھی مجھے رستگاری نہ ہوئی۔ گرمیوں میں نینی تال گیا۔ سر مالکم ہیلی (موجودہ لارڈ ہیلی) گورنر تھے۔ اُن سے ایک روز ملاقات کو گیا تو سر مالکم نے کہا کہ حکومتِ ہند کی یہ خواہش ہے کہ آپ اس وقت وائس چانسلری قبول کریں۔ میں اُن سے بہت بے تکلف تھا۔ میں نے وہ اسباب بیان کئے جو میرے خیال میں مانع تھے۔ جن میں سب سے بڑے دو تھے (۱) علی گڑھ میں پارٹی بندی جس کا لازمی نتیجہ سازشیں ہے۔ (۲) میں ابھی سیاسی میدان کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ سر مالکم ہیلی مطمئن ہو گئے اور مجھے بھی سکون ہوا۔ لیکن میرا سکون عارضی تھا۔ جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے پھر اصرار شروع کیا۔ میں نے مجبوراً دو شرطوں کے ساتھ منظور کیا۔

(۱) میرا انتخاب متفقہ ہو اور میں کسی سے رائے کے واسطے نہ کہوں گا۔

(۲) دوسرے شخص کی تلاش جاری رہے اور زیادہ سے زیادہ ایک سال کے اندر دوسرا شخص تجویز کر لیا جائے۔ سر مالکم نے میری شرائط کو مان لیا اور دہلی اطلاع بھیج دی۔

چند روز کے بعد جب سر مالکم سے ملا تو انھوں نے کہا کہ وائسرائے سے اور ہز ہائی نس بھوپال (چانسلر مسلم یونیورسٹی) سے بات چیت ہوئی۔ وہ یہ کہ ہز ہائی نس کو میرے تقرر سے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے کہا میری پہلی شرط تھی متفقہ انتخاب۔ اگر چانسلر نہیں چاہتے تو میرے وائس چانسلر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سر مالکم نے مجھ سے اتفاق کیا اور یہ قصہ ختم ہو گیا۔

انسان کی فطرت اور اس کی کمزوریاں بھی عجیب ہیں۔ ہز ہائی نس کے اختلاف نے مجھے ایک خلجان سے بچا لیا۔ لیکن جہاں چھٹکارہ ہونے کی مسرت تھی وہاں مجھے اس کی ناگواری تھی کہ ہز ہائی نس نے کیوں اختلاف کیا۔ میں ان الفاظ کو لکھتے ہوئے یہ جانتا ہوں کہ میری کمزوری تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ چاہے ہم خود کسی چیز کو اختیار کریں یا نہ کریں لیکن اگر دوسرا یہ کہے کہ ہم میں اس کام کی اہلیت نہیں تو ہمارے نفس کو ٹھیس لگتی ہے۔

(ہز ہائی نس سر حمید اللہ خاںؒ والئی بھوپال)

ہز ہائی نس سے مجھے اُس زمانہ سے نیاز حاصل ہے جب وہ علی گڑھ میں طالب علم تھے۔ ہز ہائی نس نے

ہز ہائی نس نے علی گڑھ سے بی ۔ اے کیا۔ انھیں اس دار العلوم اور یہاں کے طلبار سے گہرا تعلق ہے۔ یہ اپنی ذہانت، تدبر، معاملہ فہمی اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے نہ صرف والیانِ ملک میں بلکہ فرزندانِ دار العلوم علی گڑھ کے زمرہ میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ بڑے اچھے دوست ہیں۔ فرقہ وارانہ ذہنیت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ آج بھی جبکہ وہ حکمراں نہیں ہیں اگر سوال کیا جائے تو اہلِ بھوپال بغیر امتیاز ملت اس کی تصدیق کریں گے۔ وہ کھیلوں کے بڑے شائق ہیں۔ ٹینس۔ کرکٹ۔ پولو سے بڑا شغف ہے۔ وہ اور راجہ جے پور اپنے زمانہ میں ہندوستان کے بہترین پولو کھیلنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا ہینڈی کیپ (۹) تھا۔ بندوق بہت اچھی چلاتے ہیں۔ گن اور رائفل دونوں کا نشانہ بے مثل ہے۔ ہمعصر والیانِ ریاست میں ہز ہائی نس ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ علاوہ اُن کی ذاتی صلاحیت کے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہز ہائی نس کی والدہ محترمہ نے اسے پسند فرمایا کہ ان کی تعلیم عام نوعمر بچوں کے ساتھ علی گڑھ میں ہو اس وجہ سے ہز ہائی نس کا ذہنی اور دماغی نشو ونما بڑے جاندار اور صحت مند ماحول میں ہوا۔ اور موصوف دربار کے اثرات سے محفوظ رہے۔ ہز ہائی نس طبعاً خود دار اور آزاد خیال ہیں۔ انگریز کے زمانے میں برٹش افسران کو یہی شکایت تھی اور آزادی کے بعد سردار پٹیل سے کبھی نہ بنی۔ اگر کام لیا جاتا تو وہ ملک کے لئے بڑے کارآمد ہوتے

ہز ہائی نس بھوپال کا ذکر تو درمیان میں آگیا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وائس چانسلری کا قصّہ ختم ہوگیا۔

سر مالکم ہیلی چلے گئے اور سر ہیری ہیگ گورنر ہوئے اور لکھنؤ میں میری طلبی ہوئی۔

جب میں گورنمنٹ ہاؤس پہنچا تو پہلے سر فضل حسین سے ملا۔ اُن کے پاس ڈاکٹر ولی محمد بیٹھے تھے۔ سبب طلبی وہی وائس چانسلری تھی۔ سر فضل حسین مرحوم مجھ سے گفتگو کے بعد غسل خانہ تشریف لے گئے۔ میں نے تنہائی میں ڈاکٹر ولی محمد سے پوچھا کہ اُن کا مشورہ اس معاملہ میں کیا ہے۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ میرے واسطے یہ ذمہ داری لینا مناسب نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد گورنر کے دفتر میں ہم لوگ بلائے گئے۔ سر شاہ سلیمان مرحوم اور چودھری نعمت اللہ صاحب بھی شریک جلسہ تھے۔

گفتگو شروع ہوئی اور سر فضل حسین مرحوم نے ان الفاظ میں تقریر ختم کی "اگر نواب صاحب آستین چڑھا کر کمر باندھ کر کھڑے ہو جائیں تو اس درسگاہ کی بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔"

میں نے وہ خط جو سر فضل حسین نے مجھے شروع میں لکھا تھا اور جس میں مرحوم نے میری رائے سے اتفاق کیا تھا کہ میں وائس چانسلری کے واسطے موزوں نہ ہوں گا جیب سے نکال کر گورنر کو یہ کہتے ہوئے دیا کہ پہلے سر فضل حسین کی یہ رائے تھی۔ گورنر نے وہ خط سر فضل حسین مرحوم کو دیا۔ آخر کار بحث اس پر شروع ہوئی کہ پھر کون ہو۔

میں نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کا نام پیش کیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے میری تائید چودھری نعمت اللہ صاحب نے بھی فرمائی۔ اور یہ طے پایا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم وائس چانسلری کے واسطے کھڑے ہوں۔ یوں دوسری بار مرحوم وائس چانسلر ہوئے۔ اسی سلسلہ میں ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔

تیسری چانسلری کے انتخاب سے پہلے مجھے ہز ہائی نس نے بھوپال یاد فرمایا۔ میں فوراً حاضر ہوا۔ شب کے کھانے کے لئے باہر بیٹھے تھے۔ بھائی سلام الدین اور بھائی حیات بھی بیٹھے تھے۔ ہز ہائی نس بھی تشریف فرما تھے۔ یاد نہیں مگر یا تو سلام الدین صاحب نے یا حیات صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اگر آپ وائس چانسلری کو قبول کر لیں تو ہم لوگ متفقہ تائید کریں۔ میں نے کہا کہ

"You choose me as lesser evil but you must now have greater evil."

ختم شد